سائرہ رضا

محبت راہ کا موسم

مکمل ناول

عبدالعزیز اور ان کی بیگم کے لیے یہ خبر ایک دھچکا تھی کہ عبدالعزیز کی رشتے کی بہن پھوپھی بھولی نے پروفیسر اللہ دتا ریاض کا سمیرا سے رشتہ توڑ دیا ہے اور اس کی جگہ حمیرا کے لیے رشتہ دے دیا ہے۔

سمیرا کا رشتہ اللہ دتا ریاض عرف اے ڈی ریاض سے بچپن سے طے تھا۔

سمیرا عبدالعزیز کی بیٹی اور حمیرا ان کی بھتیجی تھی۔ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی عبدالمجید کو پڑھائی لکھائی سے کوئی دلچسپی نہ تھی' اسے صرف گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔ اس نے اپنے اس شوق کی خاطر ڈرائیوری کا پیشہ منتخب کیا۔ عبدالعزیز کو یہ بات پسند نہ تھی لیکن وہ خاموش ہو گئے۔ عبدالمجید نے ایک لڑکی صفیہ کو پسند کیا۔ عبدالعزیز رشتہ لے کر گئے تو لڑکی والوں







نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن عبدالمجید نے اس بات کو تسلیم نہ کیا اس نے صفیہ سے بات کی۔ صفیہ نے اس کی خاطر اپنا گھر چھوڑ دیا اور گھر والوں کی مرضی کے خلاف عبدالمجید سے شادی کر لی۔

عبدالعزیز کو یہ بات پتا چلی تو وہ سخت ناراض ہوئے اور عبدالمجید کو گھر چھوڑنے کے لیے کہہ دیا۔

عبدالمجید اپنا حصہ لے کر چلا گیا اور کرائے پر گھر لے کر صفیہ کے ساتھ اپنی دنیا بسالی۔

حمیرا دس سال کی تھی جب عبدالمجید ایک حادثے میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ صفیہ کے گھر والے اسے قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ صفیہ بے سہارا تھی۔ گھر بھی کرائے کا تھا۔ ایسے میں عبدالعزیز نے بھاوج اور بھتیجی کے سر پر ہاتھ رکھا اور انہیں اپنے گھر لے آئے۔ صفیہ کو اپنی بچی کے مستقبل کی فکر تھی کہ لوگ اسے ماں کے طعنے دیں گے۔

عبدالعزیز نے ان کے اطمینان کی خاطر اپنے بیٹے معید سے حمیرا کا رشتہ طے کر دیا۔

صفیہ کو عبدالعزیز کی بیوی ناہید اور بیٹی سمیرا کے غیر معمولی حسن سے شدید حسد محسوس ہوتا تھا لیکن انہوں نے اسے چھپائے رکھا تھا۔ یہ حسد نکالنے کا موقع اس وقت ملا جب ناہید نے انہیں پھوپھی بھولی کے پاس سمیرا کی شادی کے لیے عندیہ لینے بھیجا۔ صفیہ نے سمیرا اور ناہید کی برائیاں کر کے پھوپھی بھولی کو شدید بدظن کر دیا۔

حمیرا بہت سادہ مزاج اور محبت کرنے والی طبیعت کی مالک تھی لیکن وہ ذہین بھی بہت تھی۔ اے ڈی ریاض نے اس کی ذہانت کو بھانپ کر اس کی پڑھائی میں مدد کی اور اس نے ایم اے کر کے جاب کر لی۔ اس کی اعلا پوزیشن اور بھاری تنخواہ نے پھوپھی بھولی کا ذہن بھی بدل دیا۔

پھوپھی بھولی اس وقت بیوہ ہوئی جب اس کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا بہت چھوٹی عمر کے تھے۔ پھوپھی بھولی کا اکلوتا بیٹا اے ڈی ریاض بہت ذہین اور پڑھائی میں اچھا تھا۔ گاؤں کے ماسٹر نے مشورہ دیا کہ پھوپھی بھولی شہر میں شفٹ ہو جائے اور اللہ دتا ریاض کو تعلیم دلائے۔ پھوپھی بھولی نے عبدالعزیز سے مدد لی۔ عبدالعزیز نے انہیں اپنے گھر کے برابر میں گھر دلا دیا۔ پھوپھی بھولی نے سلائی کڑھائی کر کے اے ڈی ریاض کو تعلیم دلائی۔

سمیرا اور اے ڈی ریاض بچپن سے اپنے رشتے سے واقف تھے اور دونوں کے درمیان خاموش محبت کا رشتہ بھی استوار تھا

حمیرا اور معید بھی اپنے رشتے سے واقف تھے۔ حمیرا معید کے لیے گہرے جذبات رکھتی تھی۔ لیکن معید کے ساتھ پیش آنے والے ایک حادثے نے حالات کا رخ یکسر بدل دیا۔

دوسری اور آخری قسط

"میں نے سوچا تھا تمہیں پائلٹ بناؤں گی۔" ناہید کی نگاہیں آسمان پہ اڑتے جنگی جہاز کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھیں۔ وہ آج بیٹے کے ساتھ ٹہلنے آئی تھیں۔ ابو کو کسی ضروری کام سے صبح صبح نکلنا تھا۔ اس نے تو باپ سے کہا تھا کہ وہ اکیلا چلا جائے گا پھر نہیں جاتا، مگر ابو اور امی دونوں ہی اس کا ناغہ نہیں چاہتے تھے۔ سو ناہید چادر لپیٹ کر اس کے ہمراہ آگئیں۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔" جہاز کا شور کم ہوا تو ناہید نے بیٹے کو دیکھا۔ وہ دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔ کچھ پل جاتے جب دوسرا جہاز نمودار ہو جاتا۔ جنگی مشقیں کرتے جہاز۔۔۔ وہ بھی یہی سوچا کرتا تھا، مگر اب اس موضوع پر بات کرنا بھی کس قدر تکلیف دہ تھا۔

"وہ دیکھیں، آموں پر بور آنے لگا ہے، کچھ دن بعد آپ اچار بنانے کے لیے کمر کس لیں گی۔"

اس نے ہاتھ کے اشارے سے آموں کے باغ کی سمت اشارہ کیا۔ اس کا لہجہ شگفتہ تھا، مگر ناہید کی نگاہیں دوسرے جہاز پر تھیں۔ یہ نظر آیا۔۔۔ سر سے گزرا۔۔۔ زوں ل ل ل اور غائب۔

"بادلوں کو چیر دینے والے انسان۔۔۔ میں چاہتی تھی تمہیں ہواؤں میں اڑنے والا بنا دوں۔" ناہید کسی

خاص دھیان میں چلی گئی تھیں۔ اس کا موضوع بدلنا بے سود ثابت ہوا۔ "تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو ان شاء اللہ۔"

"میں زمین پر چلنے کے قابل نہیں رہا۔ آپ ہوا میں اڑانے کی بات کرتی ہیں۔" وہ اسے ملامتی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔

"کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ... میں آپ لوگوں کے لیے صرف دکھ کا باعث ہوں۔" اس نے دل کی بات کہی۔ چھوٹی سی بات، مگر کہتے ہوئے، جو جبر خود پر کیا اور جو قہرماں پر ڈھایا۔ اُف خدا۔

ہاں وہ اس کے لیے دکھی تھیں۔ ساری دنیا سے زیادہ... مگر وہ خود بھی تو اپنے... لیے دکھی تھا۔ ہاں اظہار بہت کم کرتا تھا۔ انہیں لگا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں گی۔

"میری طرف سے کوئی خوشی نہیں ملی آپ کو..." وہ کہہ رہا تھا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو میرے چاند...!" ناہید نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھام لیا، انہیں ایڑیاں اٹھانی پڑی تھیں۔ ان کا اونچا لمبا بیٹا، مگر... سسکی کو دبانا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ آہ... کو... ہاہاہا سے بدلنا۔

"تم تو میرا جشن ہو، جسے میں ہر روز مناؤں تب بھی دل سیر نہ ہو۔ میرے پیارے بیٹے...!" انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"اوہو۔ ہوا ای۔ کیا کرتی ہیں۔ ہم روڈ پر کھڑے ہیں۔" اس نے سٹپٹا کر چاروں طرف دیکھا۔ دور مسجد کے گنبد تھے۔ آموں کا باغ... اور کھیت... دور چلتا ٹریکٹر... اسکول کو جاتی ننھی بچیوں نے حیرت سے اس منظر کو دیکھا تھا۔ اور جو نہیں دیکھ پائی تھیں انہیں اشارے سے بتایا تھا دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے۔



سمیرا کو سجنے سنورنے کا شوق تھا۔ اور سردیوں کا یہ موسم اس شوق کو جلا بخشنے کا خوب موقع فراہم کرتا تھا۔ ابھی موسم کی پہلی ہوا ہی چلی تھی۔ اور ہلکے رنگوں کو پسند کرنے والی سمیرا نے کچھ شوخ لباس معمولات میں شامل کر لیے تھے۔

اور اس وقت اے ڈی کے سراہنے پر اس نے بے ساختہ گردن جھکا کر خود کو دیکھا۔

"تم پر یہ رنگ، بہت سج رہا ہے۔"

ہلدی رنگ کے پلین سوٹ پر سیاہ ہلکی شال۔ سیاہ پمپ شوز۔ قمیص کے گلے اور آستین پر سیاہ کڑھائی اور ننھے شیشے ٹکے تھے۔ اس کے ہاتھ کی گھڑی کا پٹا زرد تھا۔ اسے اپنے آپ پر پیار آیا۔ صبح آئینے نے بھی یہی کہا تھا۔ وہ سج رہی تھی۔ اسکول میں کتنے ہی کولیگز نے سراہا۔ مگر دل میں ویسی خوشی نہ ابھری جیسی کہ ابھی۔

"صرف یہی رنگ...؟" اس کے لہجے میں مان آگیا۔

"نہیں سارے رنگ۔"

"پر کبھی کہا تو نہیں۔"
"ابھی کہہ رہا ہوں ناں۔"
"آپ کو نہیں لگتا۔ بڑی دیر کی مہربان آتے آتے۔"

وہ دونوں بہت آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آرہے تھے۔ وہ جواب کے لیے بیچ راستے رک گئی۔ اے ڈی کو بھی رکنا پڑا۔ یہ سمیرا کا اسکول تھا۔ وسیع رقبے پر پھیلی عمارت اور میدان اور عمارت سے مین گیٹ تک پارکنگ کے لیے پیدل آنا پڑتا تھا۔

اس وقت رش نہیں تھا۔ مگر پھر بھی چیدہ چیدہ آتے جاتے لوگ... سمیرا کے لبوں کی شریر مسکان... یہ اس کی اپنی گلی تھی۔ یہاں وہ شیر تھی۔ ٹھیک ہے ایسے تو پھر ایسے ہی سہی۔

"دیر لگی آنے میں ہم کو۔ شکر مگر ہم آئے تو۔"
اے ڈی ریاض نے شعر کو اپنے مرضی کی شکل میں ڈھالا۔

سمیرا ہنس پڑی، کتنی ہی نقرئی گھنٹیاں بجنے کا گماں ہونے لگا تھا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ مسکرائی۔
"شکر ہے آپ منیر نیازی کے پیروکار نہیں نکلے۔" اس نے ذومعنی بات کی۔

"ہاں!" اے ڈی ریاض نے بلند قہقہہ لگایا۔ "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں"۔

"جی۔" وہ شعر بوجھ لینے پر شگفتگی سے مسکرائی۔
ہوا سے اڑتے بالوں کو بار بار جمانا پڑتا تھا۔ اس نے سر پر شال کو اچھی طرح جمایا اور قدم بڑھائے۔

اے ڈی ایک قدم پیچھے تھا اس نے سر اٹھا کر آسمان سے ہم کلام پیڑوں کو دیکھا ہوا شاخوں کو جھولے دے رہی تھی۔ ہاں ذرا اور زور سے... بس اتنا کہ شال دوبارہ ڈھلک جائے اور وہ صبیح چہرے پر زلفوں کی اٹھکھیلیوں سے نبرد آزما ہو تا اسے دیکھ سکے اور پھر اپنی خدمات پیش کر دے۔ انہیں سمیٹ دے بار بار... کئی بار۔

"آپ رک کیوں گئے۔" سمیرا نے پلٹ کر اسے پکارا تھا۔

"آں... نہیں آرہا ہوں۔" اے ڈی جست بھر کے اس کے ہم قدم ہو گیا۔

"آج ادھر کیسے؟" وہ دوبارہ ہم قدم تھے۔

"بس یوں ہی ادھر کسی کام سے آیا تھا۔ سوچا، تمہیں دیکھ لوں تو ساتھ چلیں گے۔" وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا۔ سمیرا نے مسکراہٹ کو قابو میں کیا۔

"ایک بات کہوں۔"
"ہوں۔"
"برا تو نہیں مانیں گے۔" اس نے پیش بندی چاہی، نجانے کیا پوچھنا تھا۔

"بالکل نہیں۔" وہ اس کی بات کا برا کیسے مان سکتا تھا۔

"آپ صاف بات کیوں نہیں کر لیتے۔"
"صاف بات کون سی؟" اے ڈی واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"یہی کہ آپ ساتھ چلنے کی خواہش کو بہانے میں چھپا کے لے آئے ہیں۔"

"سمیرا" اب کی بار اے ڈی ریاض بیچ راستے میں رک گیا تھا۔

"سب کچھ جانتے بوجھتے بھی سوال پوچھنے والے لوگوں کو قیامت کے دن سخت گناہ ہو گا۔" اے ڈی نے اپنی بلا کی پرکشش آنکھوں میں شکوہ بھر کے اسے دیکھا۔ سمیرا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ صاف بات کیا کریں کہ۔" سمیرا کا لہجہ متبسم تھا۔ مگر بیچ میں اٹک گئی۔ یہ کیسے کہتی کہ پندرہ دن سے زیادہ آپ مجھے دیکھے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔

"ہاں ہاں... بات پوری کرو" وہ شرارت کے موڈ میں آگیا تھا۔

"نہیں بس اتنی ہی تھی۔"

"ناں بات پوری کرو۔ ورنہ میں یہیں کھڑا ہوں۔" اس نے دھمکی دی۔

"میں چلی جاؤں گی۔" اس پر دھمکی کارگر نہ ہوئی۔

"میں کل صبح تمہیں یہیں ملوں گا۔ اسی طرح کھڑا۔"

"مشکل ہے۔" اس نے بیگ کو اپنے کندھے پر جماتے ہوئے کہا۔ "پھپھی بھولی نے سارے شہر کو دوڑا دینا ہے۔ کہ میرا اے ڈی پتر کہاں رہ گیا ہائے لوکو ڈھونڈو۔" اسے ہنسی آرہی تھی۔

"نہیں... وہ ڈھونڈنے کا نہیں کہیں گی۔ سیدھی یہاں آکر رکیں گی۔ انہیں پتا ہے کہاں جاکر بیٹا پتھر کا ہوجاتا ہے۔ راستہ بھول جاتا ہے۔"

"پھپھی کی ایک دھاڑ سے پتھر پگھل جائے گا سر جھکا کر ان کے پیچھے۔" وہ اے ڈی کو اس کی فرماں برداری یاد کروا رہی تھی۔

"ان کے پیچھے تو مجھے ہمیشہ سر جھکا کر ہی چلنا ہے سمیرا!" اے ڈی کا چہرہ متبسم تھا اس پر ماں کے لیے محبت واحترام کا جذبہ ابھر آیا تھا۔ "کیونکہ انہوں نے مجھے چلنا سکھایا ہے۔ وہ میری ماں ہیں۔ اور وہ یہ جانتی ہیں۔ میں قدم سے قدم ملا کر کس کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔"

سمیرا نے اے ڈی کے جملے کی گہرائی کو دل سے محسوس کیا۔ بڑی گہری بات کہہ دی تھی اے ڈی نے اور اس سے زیادہ گہرائی سے وہ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"انہوں نے آپ کے کان پکڑ لینے ہیں۔ ہائے اللہ دتہ کالج کے منڈوں کو کڑیوں کے اسکول کالج کے پھیرے لگاتے دیکھا تھا۔ تو اتنا وڈا پروفیسر ہو کر یہ کام کرتا ہے۔ ہائے ہائے کے ساتھ ساتھ وہ ہاتھ بھی ملتی جائیں گی۔"

"میں تمہیں پک کرنے آیا تھا۔ کہاں بس کے دھکے کھاتیں۔"

"میں وین میں آتی ہوں۔" اس نے بتایا۔

"رہنے دو، یہاں نیکی کرنا یعنی گناہ کرنا۔ میں تمہارا بھلا چاہ رہا تھا۔ وین میں اتنا رش ہوتا ہے۔"

"آپ صاف بات کیوں نہیں کرلیتے اے ڈی!" وہ وہیں آکر اٹک گئی۔

"ٹھیک ہے۔" اے ڈی نے گھڑی میں وقت دیکھا۔

"سامنے بیٹھ جاؤ... وہاں بینچ پہ... میں آج تمہیں صاف صاف بات بتا ہی دیتا ہوں۔"

"پلیز..." اس کی ساری طراری اڑن چھو ہوگئی۔ "ہائے اس کا اسکول... کوئی دیکھے گا تو... اف" اس نے دو قدم سرکتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"بس اتنی ہمت تھی۔" وہ جتا رہا تھا۔

"ہاں اتنی ہی تھی۔" اس نے ہار مان لی۔ اے ڈی ہنس دیا۔ ہراساں ہو کر وہ اور پیاری لگی تھی۔



امی کو منانے کے لیے اس نے سچ مچ جان ماری تھی۔ صحن میں جھاڑو بھی دی گھس گھس کر پونچھا لگایا... سارے گھر کی جھاڑ پونچھ بھی کر دی۔ دوپہر کے کھانے میں امی کو دکھا کر سلاد کا پیالہ کھالیا۔ شام کو چائے کے ساتھ پاپے کھاتے ہوئے دل کی حالت وہ جانتی تھی۔ مگر بھوک کی نقاہت چہرے سے بھی عیاں ہونے لگی۔

ماں تو پھر ماں ہوتی ہے۔ صفیہ خود اٹھیں آلو گوشت کے سالن سے تری ہٹا کر ایک نرم پھلکا بھی بنا لائیں۔

"رہنے دیں سارے دن کی محنت برباد ہو جائے گی۔ میں گزارا کرلوں گی۔" اس نے پاپے کی تھیلی سے ایک پاپا اور نکالا۔

حمیرا کھانے سے منہ موڑے بیٹھی تھی۔ صفیہ کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ وہ ماں تھیں اس کا برا تو نہیں چاہتی تھیں۔

"تم نے صفیہ! بلاوجہ ہی بچی کو اتنا سنا دیا۔ جتنا وہ کل میرے ساتھ بازار میں گھومی پھری۔ ساری انرجی تو خرچ ہوگئی۔ اس ایک شوارمے یا کولڈ ڈرنک سے کیا فرق پڑنا تھا۔" بڑی امی نے کہا۔

"بھئی، آج کل ٹی وی میں یہی تو بتاتے ہیں ناں۔ کیلوریز خرچ کرنا پھر اس حساب سے کھانا۔ جسم پر نہیں لگتا۔" انہوں نے وضاحت دی۔ "یہ بھی ٹی وی

والے ہی بتاتے ہیں۔ کہ سونے سے تین چار گھنٹے پہلے رات کا کھانا کھالینا چاہیے۔ ہمارا تو مذہب بھی مغرب کے بعد کھانا کھالینے کی ترغیب دیتا ہے۔ عشاء پڑھیں گے تو سب ہضم..... وزن کبھی نہیں بڑھے گا۔ اسے کھانا ہی تھا تو کم از کم رات نو تک کھالیتی۔"

"یہ تو آپ اب کہہ رہی ہیں۔ میں اگر نو بجے کھانے لگتی۔ تو آپ کوئی دوسری تقریر کرتیں۔"

"اور چھپ کر کیوں کھایا؟" صفیہ کو یہ بات بھی پسند نہیں تھی۔

"دکھا کر کھاتی تو آپ چھین کے پھینک دیتیں۔" حمیرا کے شکوہ بھرے جواب پر صفیہ نے نظریں چرا لیں۔ وہ ایک بار اس کے ہاتھ سے سموسے چھین چکی تھیں۔

"کھانا کھالو....." صفیہ کھڑی ہو گئیں۔ "اسے کھلا دیں بھابھی! میری تو یہ سنے گی نہیں۔" اس کا منہ ہنوز پھولا ہوا تھا۔ صفیہ کو جیٹھانی سے کہنا پڑا۔

"میں نے کہا تھا ناں تمہاری ماں کو پتا لگ گیا تو ناراض ہوگی۔"

"آپ کو تو کچھ نہیں کہا۔ مجھے ہی سنائیں ساری۔" وہ لقمہ بناتے ہوئے بولی۔ کیا خوشبو اٹھ رہی تھی آلو گوشت کے سالن سے۔

"یہی تو بات ہے وہ مجھے کچھ نہیں کہتی..... ایک بات بتاؤ تمہاری ماں کیا ہمیشہ ایسی ہی تول تول کر بولنے والی ہے۔" انہوں نے کئی بار کا کیا ہوا سوال دہرایا۔

"کوئی نہیں..... حمیرا کا سر نفی میں ہلا۔ "باتیں کرتی تو ہیں۔ بلکہ ایسے ایسے پوائنٹ مارتی ہیں کہ بندے کے پاس کوئی جواب ہی نہیں رہتا۔"

"ہاں۔ تم سے تو کرتی ہے باتیں وہ..... مگر دیکھو ناں کتنے سال ہو گئے اسے یہاں آکر رہتے ہوئے مگر ہم بس ضروری بات چیت ہی کر رہے ہیں کوئی ناراضی بھی نہیں۔ کبھی کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا۔ مگر اس نے اپنے گرد ایک دائرہ سا کھینچ رکھا ہے۔"

ان کا لہجہ دلگیر سا ہو گیا۔ ایک ہی گھر میں رہتے افراد کے درمیان ان دیکھے فاصلے بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ صفیہ کا اول روز سے بہت نپا تلا انداز تھا۔ شروع میں اس رویے کو جھجک کہہ کر نظر انداز کیا گیا۔ لیکن! تھوڑا وقت اور گزرا تب نئی چیز پتا لگی۔ صفیہ محلہ پڑوس اور خاندان میں بہت ملنسار اور بے تکلف نظر آنے لگیں۔ وہ دکھ درد بھی سنتیں۔ خوشی غمی میں جایا کرتیں' مشورے بھی دیتیں' مددگار بھی نظر آتیں۔ مگر بس جیٹھانی سے ایک حد فاصلہ برقرار رکھا۔

"رہنے دیں بڑی امی! آپ کو اس دائرے کے اندر آکر کرنا بھی کیا ہے۔ کچھ نہیں رکھا اندر۔" حمیرا انگلیاں چاٹ رہی تھی۔ "میں رہتی ہوں ناں اس دائرے کے اندر.... اوہ...." اس نے جیسے پناہ مانگی۔ "یہ کرو.... وہ نہ کرو.... یہ اچھا ہے وہ برا ہے۔ یہ کھاؤ اور یہ بالکل مت کھاؤ ایسے چلو.... ایسے بولو۔ تو جی کیا میں نے ایف ایم میں کام کرنا ہے۔ یا کیٹ واک کرنی ہے۔ ہر وقت کی روک ٹوک۔"

بڑی امی ہنستی رہیں۔

"ماں کو ناراض نہیں کرتے۔"

"تو جی میں نے کب کیا۔ بلکہ راضی کرنے کے لیے کتنے کشٹ اٹھائے۔ آپ تو گواہ ہیں بڑی امی۔" اس کا اشارہ صبح سے اب تک کیے جانے والے اپنے کاموں کی طرف تھا۔

"تمہاری ماں نے مجھ سے کہا ہے۔ ماسی کو چھٹی دے دوں۔ تم سے کراؤں سارے گھر کے کام خصوصاً" جھاڑو پوچا" آٹا گوندھنا وغیرہ۔"

"اتنے پر ہی اکتفا کیوں۔ گلی کے دو چار گھر اور بھی لے دیں صفائی کے ساتھ کپڑے بھی دھو دوں گی۔ اچھا ہے میں بھی چھٹیوں میں چار پیسے کما لوں گی۔" اس کی تو جان جل کر خاک ہو گئی۔ گوشت آلو کا مزا کرکرا ہو گیا۔

"اللہ نہ کرے' تم کوئی ماسی ہو۔"

"پر امی تو چاہتی ہیں ناں۔ انہیں میں موٹی بطخ لگتی ہوں۔ کہتی ہیں آواز بھی بطخ جیسی ہے۔" وہ آزردہ نظر آنے لگی۔ (بڑی اداکاری..... اسے اپنے آپ سے بڑا پیار تھا۔ اپنی ہر چیز اچھی لگتی تھی۔)

"کیا میں واقعی ایسی ہوں جیسا امی کہتی ہیں۔" اس

 نے گال پھلا کر منہ اونچا کیا۔
"بلخ جیسی۔" بڑی امی کو زور سے ہنسی آ گئی۔ مگر حمیرا سنجیدہ اور رنجیدہ نظر آئی تھی۔ جواب دینا لازمی تھا۔
"غلط کہتی ہے صفیہ۔۔۔ تم چڑیا ہو۔ گدگدی سی چڑیا جو ذرا سے پر پھیلا کر بیٹھی ہو۔ اور آواز بھی چڑیا جیسی ہے۔"
"سچ۔۔۔" اس نے فوراً" یقین کر لیا۔ خوشی سے تالی پیٹی اور کھڑی ہو گئی۔
"اب کہاں جا رہی ہو۔ ایسا کوئی کام نہ کرنا جس سے ماں ناراض ہو۔"
"نہیں نہیں۔۔۔" اس نے قطعیت سے انکار کیا۔ "میں تو کہانی لکھ رہی ہوں۔"
"کہانی؟ وہ کس لیے۔؟"
"کس لیے کیا مطلب۔۔۔ کہانی کس لیے لکھتے ہیں؟ پڑھنے کے لیے۔"
"مطلب۔۔۔" ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ "یعنی پہلے لکھو گی پھر پڑھو گی؟"
تو اتنی مشکل میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اتنی ڈھیر کتابیں سمیرا نے اکٹھی کر رکھی ہیں انہیں پڑھو۔ کوئی مصیبت پڑی ہے کہ پہلے لکھنے میں سر کھپاؤ گی پھر پڑھنے بھی خود بیٹھ جاؤ گی۔"
"اوہ بڑی امی۔!" اس نے تاسف سے سر پر ہاتھ مارا۔ "مجھے تو پڑھنا پڑے گا ناں۔ میں خود اپنے لکھے کو ریسپکٹ نہیں دوں گی تو کسی اور سے کیا امید۔"

☼ ☼ ☼

"سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ہیروئن کے سوٹ کا رنگ کیا رکھوں اور کون سا کٹ ہو۔" قلم کی نوک ہونٹوں میں دبائے وہ واقعی مصنفہ لگ رہی تھی۔ پرسوچ چہرہ۔ خلا میں تکی نگاہیں، سنجیدگی کمال کی۔۔۔ سمیرا بھی سوچ میں پڑ گئی۔
"فرنچ کٹ لکھ دو۔" معید کی بلند آواز اندر تک آئی۔
"فرنچ کٹ۔۔۔ کس چیز کا؟" اس نے بھی ہانک لگائی۔
"داڑھی کا۔"
"داڑھی۔!" اس کے منہ سے قلم پھسل گیا۔ "میں ہیروئن کی بات کر رہی ہوں معید! اس کے ڈریس کا کٹ۔"
"اوووہ۔!" کھڑکی میں اس کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ "میں سمجھا ہیرو ہے۔" "میرا ہیرو کوئی فرنچ کٹ وٹ نہیں رکھے گا۔"
"کوئی زبردستی ہے۔" معید نے کہنی چوکھٹ پر ٹکائی موضوع دلچسپ تھا۔ "ہو سکتا ہو وہ رکھنا چاہتا ہو اسٹائل ہے ناں یار۔"
"خوامخواہ اسٹائل ہے، میں شیو کر دوں گی منٹ کے اندر۔" وہ زمین پر جھک کر قلم اٹھا رہی تھی۔ "قلم سے۔"
سمیرا کو ان دونوں کو دیکھ کر ہنسی آنے لگی۔
"پاگل ہو دونوں۔" اس نے فیصلہ دیا۔
حمیرا کی نگاہیں سمیرا کے سراپے پر ٹک گئیں۔
"لو خوامخواہ کی مصیبت پالنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے تیزی سے قلم اٹھایا۔ "گہرا جامنی پرنٹڈ دوپٹا قمیص۔ بسکٹی آستین اور بسکٹی پاجامہ، پیروں میں دوپٹی۔ نفاست سے تراشے ناخن۔۔۔ اوہ۔" اس نے جھک کر سمیرا کے پیر دیکھے "اس وقت نیل پالش نہیں لگا تھا۔ اس نے وہ بھی لکھ دیا۔ مطمئن ہو گئی۔ "مجھے کیا ضرورت ہے دماغ کھپانے کی۔۔۔ تم جو کپڑے روز روز بدلو گی بس میں وہی لکھتی رہوں گی۔" اس نے چٹکی بجائی۔
"بات سنو۔۔۔ تم نے ہیروئن کیسی بنائی ہے۔ پیاری تو ہے ناں؟" سمیرا نے پوچھا۔
"مجھے بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ بنی بنائی مل گئی۔" اس نے ماؤں والے انداز میں سمیرا کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ گھمایا۔
"ہائیں!" سمیرا پیچھے کھسکی۔ "مطلب؟"
"مطلب بی بی یہ ہے کہ مجھے بنانے اور ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہ پڑی، سیدھی سیدھی سمیرا کی تشریح

لکھ دی۔ سنہری آنکھیں گلابی رنگت۔ پیارے بال پیارے ہاتھ۔۔۔ پیارا چہرہ۔ پیارا۔"

"بہت اچھے۔۔۔!" معید نے ہاتھ جھاڑے، ساتھ ہی بہن کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھا تو چپ سا ہو گیا۔ وہ واقعی اتنی پیاری تھی کہ اسے ہیروئن بنایا جاتا۔

"اور ہیرو۔" سمیرا نے لگے ہاتھوں یہ بھی جاننا بہتر سمجھا۔

"ہاں۔" حمیرا کا چہرہ اترا۔ "وہ نہیں ملا۔"

"کمال ہے۔" معید کی بلند خفا آواز ابھری۔ "تمہیں میں نظر نہیں آیا۔"

"تم۔!" وہ رجسٹر رکھ کے دھاڑی۔ شہادت کی انگلی اٹھائی "تم اور ہیرو۔"

"میں ایک ہٹ ناول لکھنے والی ہوں سمجھے تم نے ایسا سوچا بھی کیسے معید۔؟" معید کا چہرہ پھیکا پڑا مگر اس نے خود پر قابو پا کر کہا۔

"ہاں ہٹ ناول، جسے ایڈیٹر اپنے پیر کی ہٹ سے دفتر سے باہر اڑا دے گی۔"

"کیا؟" وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ "تم یہ میرے ناول کے بارے میں کہہ رہے ہو۔

"نکلو۔ فوراً" نکلو ادھر سے۔۔۔ اسے نکالو سمیرا اپنے کمرے سے۔"

اسے تو گویا پتنگے لگ گئے تھے۔ سمیرا نے جبڑے بھینچے اسے زور کی ہنسی آرہی تھی۔

"میں تو کہیں نہیں جانے والا۔۔۔ میری بہن کا کمرہ ہے۔"

"اچھا۔۔۔!" اس نے اپنا منہ کھڑکی سے باہر نکالا۔ "تایا ابو۔۔۔ تایا ابو! اس معید کو بلائیں یہ لڑکیوں میں گھس کر بیٹھا ہے۔ تنگ کرتا ہے ہمیں، بلائیں اسے۔"

"لگاتی رہو آوازیں ابو گھر پر نہیں ہیں۔" معید بے فکر تھا۔

"میں گھر آچکا ہوں صاحبزادے۔۔۔ باہر آجاؤ۔" تایا ابو کی آواز پر حمیرا نے خوشی سے تالی پیٹی اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ کہ باہر نکل جاؤ۔

"معید۔۔۔!" ابو نے دوسری آواز لگائی۔

"تم سے میں آکر نبٹتا ہوں۔" وہ دھمکاتا نکلا۔

"ہو جاؤ شروع۔" اس نے کاغذ قلم سنبھالا۔

"میں کیا بتاؤں" سمیرا گڑبڑائی۔

"ایسا کرو۔ وہ تمام کوالٹیز بتاتی جاؤ جو ایک ہیرو میں ہونی چاہئیں اگر مجھے مناسب لگیں تو لکھ لوں گی۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" سمیرا کو یہ کام ذرا آسان لگا۔ اس نے ہونٹ پر شہادت کی انگلی ٹکائی۔ سوچنے کا حسین انداز۔۔۔ حمیرا نے اس ادا کو نوٹ کیا۔ لکھ لیا۔

"سانولے رنگ پر گھنی سیاہ مونچھیں۔ لبوں پر مدہم مہربان مسکراہٹ۔ جیسے تو آنکھیں بھی مسکرائیں۔ سیاہ گھنے بالوں کا ایک گچھا سا ماتھے پر ڈھلک آئے جیسے وہ تہذیب سے دوبارہ جمالے۔" سمیرا کو ہیرو جیسے صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"قد لمبا۔۔۔ کم از کم چھ فٹ سے اوپر۔"

"سات فٹ لکھ دوں۔" حمیرا کا قلم رکا۔ اسے شاید حلیہ پسند نہیں آرہا تھا۔؟ "میں نے ہیرو بنانا ہے یا واپڈا کی سیڑھی۔" وہ قلم چھوڑ، پڑتال والا کلرک بن گئی۔

"بھئی کہانی میں ایسے ہی ہیرو کو ڈسکرائب کیا جاتا ہے۔" سمیرا سالوں سے کہانیاں پڑھتی رہی تھی۔

حمیرا نے ان سنی کرتے ہوئے اپنے لکھے کو با آواز بلند دہرانا شروع کر دیا آواز باہر تک جانے لگی "یہ حلیہ تو کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا ہے۔" اس نے مشکوک نگاہ سے دیکھا۔

سمیرا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر اس سے پہلے حمیرا کے نعرے نے اس کا منہ بند کر دیا۔

"یہ تو بھائی ریاض کا حلیہ ہے۔ پورا کا پورا پروفیسر اے ڈی ریاض۔" اس نے کاغذ قلم پٹخا اور گال بھی پھلائے اور دونوں ہاتھ کمر پر جمالیے سمیرا نے ہونٹ کا کونا دانتوں میں دبایا۔ حمیرا کو اور غصہ آیا۔

"بھائی ریاض تمہارے ہیرو ہوں گے۔۔۔ میرے نہیں ہو سکتے آئی سمجھ۔"

"کیوں کیا برائی ہے ان میں؟" سمیرا کو بھی غصہ آیا۔

"اچھائی کیا ہے۔" حمیرا نے ہاتھ نچایا "سب سے پہلے توان کا نام ہی ہیرو والا نہیں ہے۔"

"اے ڈی ریاض۔۔۔ یعنی ہیرو اللہ دتہ ریاض۔۔۔ نو۔" (سب سے بڑا اعتراض)

"اچھا!" سمیرا کے ہاتھ ۔۔ کمر پر ٹکے۔ "تو خیر سے اپنے ہیرو کے بارے میں بھی بتا دو۔"

"میرا ہیرو۔!" حمیرا نے گردن شاہانہ انداز سے اٹھائی۔ "وہ تو جب تم دیکھو گی۔ تو پتا لگے گا۔ ویسے بائی داوے تمہیں بھائی ریاض واقعی اچھے لگتے ہیں۔ یا پھر بچپن کی بات طے ہے تو اس لیے مجبوری میں۔"

"مجبوری کیوں؟ وہ اچھے ہیں۔"

"کتنے؟" حمیرا کو مزا آنے لگا۔ صفائی دینے کے چکر میں حال دل معلوم ہو رہا تھا۔

"بہت زیادہ۔"

"کتنے زیادہ؟"

"ساری دنیا سے زیادہ۔"

"اوہو۔۔۔ کیسے اگلوالیا۔" حمیرا کی ہنسی بے ساختہ تھی۔ "ورنہ تو ایسی پاکیزہ محبت ہے۔ پرانے زمانے والی۔ مجال ہے۔ جو ذرا چوری پکڑی جاسکے۔"

"جی نہیں۔۔۔ وہ ہیں ہی اتنے متین اور بردبار' ایسے چھچھورے کام نہیں کرتے۔"

"بات یہ نہیں ہے۔" حمیرا نے تالی کے انداز سے ہاتھ مارے۔

"وہ جس ماں کے بیٹے ہیں ناں' وہ انہیں کسی بھی کام سے باز رکھ سکتی ہیں محبت سے بھی۔"

"خوامخواہ۔" سمیرا انکاری تھی۔

"مان لو سمیرا! پروفیسر اللہ دتہ ریاض محبت بھی اپنی امی سے پوچھ کر کرنے والوں میں سے ہیں۔"

"پھپھی پہلے ہی مجھ سے پیار کرتی ہیں۔" سمیرا کا لہجہ طمانیت سے بھرپور تھا۔

"تم بتاؤ اپنا ہیرو۔" سمیرا نے مصنوعی خفگی سے دھمکایا۔

"بتاؤں کیوں؟ میرے پاس بھی ہے ہیرو۔" اس کے لہجے میں زعم تھا۔

"اچھا۔" سمیرا کے لیے یہ نئی خبر تھی۔ "یہ کب ہوا۔"

"ہم سے چھپاؤ گی۔" سمیرا نے مان سے کہا۔

"جی ہاں۔" اس نے رخ پھیرا۔ وہ شاید اب خود سے لکھنے لگی تھی۔ سمیرا نے دیکھنے کی کوشش کی تو اس نے بالکل جھک کر چھپالیا۔ دونوں میں چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ ہنسی بھی آنے لگی۔ سارے گھر میں گونجنے لگی۔ حمیرا کی تایا ابو کی شکایتی پکاروں پر بڑی امی کچن سے اٹھ کر آگئی تھیں۔ وجہ تو پتا چلے۔ کیا ہوا۔ دروازہ بند تھا۔ وہ بجاتے ہوئے رک سی گئیں موضوع دلچسپ تھا۔ ہنستی مسکراتی شوخیاں جملے۔۔۔ مگر بات ختم ہونے تک سوچ کے دروازے کھول گیا۔

سنجیدگی' فکر۔۔۔ بیٹی کے حال دل کی کچھ خبر تو تھی۔ مگر بات اتنی آگے پہنچ چکی تھی کہ فقط نام لینے سے لہجے میں چاشنی گھل جائے۔ آواز میں کھنک آجائے۔ یہ نہیں معلوم تھا اور اب جبکہ اپنے کانوں سے سن لیا تو فکر دوبارہ جاگ گئی جیسے پٹاری میں بیٹھا سانپ سر اٹھائے۔ پر سوچ ذہن۔ اور تھکے قدموں سے واپس پلٹی تھیں۔ دونوں کے ہنسنے کی آواز بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ بھول گیا سے بات کریں گے یا میں خود کہہ دوں؟" لڑکیوں کے کمرے سے بڑی امی اٹھ کر سیدھا عبدالعزیز کے سر ہو گئیں۔

"تم بیٹی کی ماں ہو۔ اپنے منہ سے کہتی اچھی لگو گی کیا؟"

"میں اپنے اچھے برے منہ کو دیکھوں۔ یا بیٹی کا مستقبل سوچوں۔ پہلے ہی دیر ہو چکی' ہمارے اپنے مسائل۔ آپ میری بات سن رہے ہیں ناں"

عبدالعزیز اپنے چشمے کی ڈنڈی درست کر رہے تھے۔ ہاتھ روک کر پوری طرح بیوی کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"مجھے تو آج تک وہ لمحہ نہیں بھولتا۔ جب پہلی

ملاقات کی پہلی نگاہ میں بھولی کے منہ سے وہ بے ڈھنگا جملہ نکلا۔"

انہیں سب یاد تھا بھولی اپنی چار بیٹیوں اور بیٹے اللہ دتا ریاض کے ہمراہ ان کے گھر آئی تھی۔ وہ گاؤں سے شہر شفٹ ہوگئی تھی۔ عبدالعزیز نے اپنی ہی گلی میں سامنے سے دو گھر چھوڑ کر مکان کا بندوبست کردیا تھا۔ وہ خود بھی خوش تھیں۔ دور کا ہی سہی ایک رشتہ دار قریب آکر رہنے لگے گا۔ سو دکھ سکھ خود ان کے میکے کے آدھے لوگ جہلم اور باقی ماندہ کشمیر میں رہتے تھے۔ خوشی غمی میں ہی ملنے کا آسرا ہوتا تھا۔ سسرال میں ایک دیور تھا' وہ الگ کہانی..... بھولی کا نام سن رکھا تھا۔ ایک آدھ بار کی سرسری ملاقات تھی۔

وہ اپنے حیران آنکھوں والے بچوں کے منہ میں نوالے دے رہی تھی۔ جب سمیرا اسکول سے لوٹی تھی .... سنہری آنکھوں اور سنہرے بالوں والی بچی..... دھوپ سے آئی تھی کشمیری سیب سے گال قندھاری انار بنے ہوئے تھے۔ سب کی نگاہیں اس پر ٹک گئیں۔ بھولی نے تیزی دکھائی اسے اپنی طرف گھسیٹا۔ چٹاچٹ گال چومے' اپنی حیران آنکھیں لیے بیٹھی بیٹیوں کو دیکھا۔ سلونی' بھولی بھالی بچیاں..... اور ساتھ بیٹھا اللہ دتا ریاض جو ٹکٹکی باندھے بس اسے دیکھے ہی جاتا تھا۔ سمیرا کچھ شرمائی سی۔

"اتنی سوہنی بچی عبدالعزیز..... اسے تو بس اپنے اللہ دتہ کے لیے لوں گی۔ کیوں اللہ دتا کیسی ہے؟"

بھولی نے فیصلہ سنایا تھا اور رائے اپنے بیٹے سے مانگی۔ عبدالعزیز خفیف ہوگئے۔

ہاں وہ گاؤں کی سادہ دل سادہ مزاج عورت تھیں۔ سادگی آمیز بے اختیاری۔ لیکن سمیرا کی امی کو شدید ترین جھٹکا لگا تھا۔ یہ کوئی طریقہ تھا بات کہنے کا۔

"جاؤ سمیرا! کپڑے بدل کر آؤ۔ پھر کھانا کھانے بیٹھنا۔" ان کے چہرے پر تناؤ آگیا۔

"ہاں ہاں جاؤ بیٹی۔" بھولی نے تائید کی۔ سمیرا کمرے سے نکل گئی۔ وہ پیچھے گئیں۔

"کپڑے بدل لو تو میں کچن میں کھانا کھالینا..... کمرے میں مت آنا دوبارہ۔"

سمیرا کی آنکھوں میں حیرت پھیلی۔ پر اس نے تابع داری کا مظاہرہ کیا۔ بیٹی کو تو محدود کردیا مگر خود ایک اچھا میزبان ہونے کا ثبوت دینے کے لیے بڑھ چڑھ کر مہمان داری میں پیش پیش رہیں لیکن وہ جو ایک طیش کی لہر ابھری تھی۔ وہ ماتھے پر سلوٹ بن کر ٹھہر گئی۔ پھپھی بھولی کا نام بھولی ہی تھا۔ مگر وہ کوئی سچ مچ کی بھولی تھوڑی تھی۔

"لگتا ہے بھابھی کو میری بات بری لگ گئی۔" وہ عبدالعزیز سے مخاطب ہوئی۔

"ارے نہیں بھولی آپا!"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھولی آپا۔" مجھے واقعی برا لگا۔ اتنے چھوٹے بچوں کے سامنے اس طرح کی باتیں کرنا مناسب نہیں ہوگا۔" ان کے لہجے میں بھی ناراضی عود کر آئی تھی۔

"ہاہاہا۔!" بھولی نے قہقہہ لگایا۔ "یہ شہری باتیں۔ ہوہوہو۔ میری سکینہ' صبیحہ کی منگنیاں طے ہیں اور ان کو پتا بھی ہے۔ کیوں سکینہ! بتا اپنی مامی کو "تو کس کی مانگی ہوتی ہے۔"

"اپنی خالہ کے وڈے بیٹے خورشید سے۔" ترنت جواب آیا۔ بچی سلیقے سے نوالے لے رہی تھی۔ چہرے پر پھیلی بے نیازی اور سکون..... وہ ششدر رہ گئیں۔

"تو بھی بتادے صبیحہ!" بھولی نے دوسری کو اشارہ کیا۔ ان کو عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ ہاتھ اٹھا کر روک دیا' رہنے دو بیٹا کھانا کھاؤ۔ بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔" بچی سر جھکا کر کھانے لگی۔

"وہاں گاؤں میں ایسا ماحول ہوگا آپا..... مگر ادھر شہر میں..... پلیز آپ دوبارہ یہ بات زبان پر مت لائیے گا۔ ایسی باتیں اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہیں۔ آپ بھی کچھ کہیے ناں۔" انہوں نے مدد کے لیے شوہر کو پکارا۔ یہ کس قسم کی احمقانہ گفتگو پہلی باباضابطہ ملاقات کے دوسرے ہی گھنٹے میں شروع ہوگئی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہے سمیرا کی ماں آپا..... یہاں شہر

میں یہ بچوں کے پڑھنے لکھنے کا وقت ہو ہے۔ ایسی باتیں بری سمجھی جاتی ہیں لوگ مذاق بناتے ہیں اور ویسے بھی ابھی تو آپ آئی ہیں۔ بڑا وقت پڑا ہے ایسی باتوں اور کاموں میں۔"

شوہر کے مختصر مگر بامعنی جواب سے ان کی ہمت بڑھی، چہرے پر سکون آگیا۔

"اب آپ شہر آگئی ہیں آپا۔ شہری انداز سے رہنا ہوگا۔ نئے ڈھنگ سے۔"

"اوئے۔" ان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ بری طرح چونک بلکہ ذرا سہم کر پیچھے کو سرکیں۔ بھولی نے برھک مارتے ہوئے ہاتھ سر سے اوپر کی طرف اٹھایا تھا پھر ہاتھ نیچے آیا تو شہادت کی انگلی کھڑی تھی اور چہرے کی طرح نفی میں دائیں بائیں ہلتی تھی۔

"بھولی نہیں ہے وہ عورت جس پر شہر کا رنگ چڑھے گا۔ میں اپنے اصولوں سے پیچھے ہٹنے والی کبھی نہیں۔ میں نے جو کرنا ہے وہی کرنا ہے۔ اب تمہارے ساتھ ہوں بھابھی! دیکھ لینا بیس سال بعد بھی جو بھولی ذرا بدلے۔"

اور پھر وقت نے واقعی بتادیا تھا۔ بھولی نہیں بدلی۔ وہ ویسی کی ویسی رہی۔ وہی اس کے اپنے اصول۔۔۔ اور اپنی من مانیاں۔

ان کے صاف منع کردینے کے باوجود نجانے کیسے یہ بات زبان زدعام ہوگئی۔ کہ یہ جو بھائی عبدالعزیز کی وڈی بہن گاؤں سے ادھر شفٹ ہوئی ہے۔ وہ ہی کل کو سمدھن بھی بنے گی۔ سب کی آنکھوں میں شدید حیرت ابھر آئی۔

عبدالعزیز کی مکھن ملائی بٹی۔۔۔؟؟ بھولی کا سوکھا سا سانولا بیٹا۔۔۔ جو زیادہ کھلتا ملتا نہیں تھا۔ ہروقت کتابوں کے ڈھیر میں غرق۔۔۔ اور بھولی جو سوگی سے شوہر کے مرنے کے بعد پیدا ہوجانے والے شگاف بھرنے کی کوشش میں دن رات ایک کرتی تھی۔ نوعمر بچیوں کو بھی ساتھ لگالیا تھا۔

"بھائی عبدالعزیز کیا پاگل ہوگیا ہے۔ جو اکلوتی بیٹی کو ایسے گھر میں دے گا۔" گلی کی عورتیں واقعی حیرت زدہ تھیں اپنی حیرت ان کے آگے آکر بیان کردی۔ اور وہ ہکابکا رہ گئیں۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جو بات انہوں نے خود سے بھی نہیں دہرائی تھی کہ اس قدر بھونڈی بات کا سوچنا بھی بےوقوفی ہے۔ وہ ایسے سوال بنا کر ان کے منہ پر مار رہی تھی۔

"بھولی کا دماغ خراب ہے۔" وہ پھٹ پڑیں۔ یہ اتنی لمبی سالوں پرانی منگنیاں انہیں سخت ناپسند تھیں۔ لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ بھولی اس وقت تو خاموش ہوگئی تھی۔ مگر بعد میں اپنی خواہش ہر آئے گئے کے آگے بیان ضرور کردی تھی۔

یہاں تک کہ وہ دن آگیا جب اللہ دتا ریاض نے میٹرک میں پورے صوبے میں پہلا نمبر لے کر اپنی ماں کو بھی حیران کردیا اور سمیرا کی ماں کو بھی۔

"وہ واقعی اتنا جینیس تھا؟" بڑی امی ہکابکا تھیں۔

وزیر اعلیٰ نے اسے گولڈ میڈل دیا تھا اور آگے پڑھائی کا سارا خرچا حکومت اٹھائے گی چاہے تو ملک سے باہر جاکر پڑھ لے۔

"ہائے!" پھپھی بھولی گولڈ میڈل کو ہاتھ میں لے کر تولتی پائی گئی (چلو جی اسے تڑوا کر سکینہ کے لیے جھمکے بنوالے گی ایک لڑکی کے کان تو ڈھکے گئے واہ جی واہ بعد میں وقت نے اس چیز کو ثابت بھی کیا۔ اے ڈی ریاض کے پاس صرف یادگاری تصاویر نہیں یا وہ فیتہ جس میں میڈل پرویا گیا تھا۔ سونا پھپھی نے ٹائم سے ہی سنبھال لیا تھا وہی چار لڑکیوں کے کان' ناک' گلا' بازو۔۔۔ اللہ دتا میڈل لاتا رہا۔ پھپھی بھولی کے ارادے بڑھتے گئے)

عبدالعزیز مٹھائی کے ڈبے' پھولوں کے ہار اور تحائف کے ساتھ مبارکباد کے لیے پہنچے سمیرا بھی ساتھ تھی صفیہ اور حمیرا بھی۔

پھپھی نے موقع شناسی کا مظاہرہ کیا۔ دو سال پرانا سوال ایک بار پھر دہرادیا' بڑی امی کے حساب سے اب بھی ایسی باتوں کا وقت نہیں تھا' مگر پھپھی اپنی ہی سنا رہی تھیں۔

"دیکھ بھائی عزیز! تم دونوں صرف دو بھائی۔ ایک اللہ کو پیارا ہوگیا پیچھے چھوڑی بٹی۔۔۔ ادھر تیرے

سورہے (سسرال) میں بھی تیری بیوی سب سے بڑی بیٹی تھی تو اس کے بھانجے بھتیجے' سمیرا سے کتنے کتنے سال چھوٹے ہیں صاف نظر آتا ہے' جب تو نے بیٹی بیاہنے کھڑا ہونا ہے تو باہر والوں کا ہی منہ دیکھنا ہے یا پھر خاندان برداری کو پھولے گا (چھانٹا) تو یہ بہتر نہیں ہے میرے اللہ دتا پر ہاتھ رکھ دے۔ اب بیٹا میرا بھی پڑھا لکھا ہے (میٹرک فرسٹ ڈویژن گولڈ میڈل) تیری لڑکی بھی پڑھتی ہے تو کیوں نہ ہم دونوں کرلیں ان کا رشتہ آپس میں... منہ زبانی ہی... شادی کے ٹیم (ٹائم) ڈھول واجے کرلیں گے۔ ویسے بھی میرا حق سب سے زیادہ ہے۔ تم دونوں بھائیوں کے کلے کلے (اکلوتے) تائے کی کلی کلی نشانی میں ہی تو ہوں۔ ایک ہی گھر کے جم پل (پیدائش' پرورش) ہیں ہم... تم دونوں پیدا ہوئے تو میں گھر گھر جاکر بتاتی تھی۔ میرے بھائی پیدا ہوئے ہیں اپنے ہاتھوں تم دونوں کو ہی اللہ بخشے عبدالمجید کو... نہلاتی تھی' دھلاتی تھی' تیل سرمالگا کر تیار کرکے سارے دن کھچڑ لیے (کمر پر ٹکائے) پھرتی تھی۔ منہ سرچوم کے رکھتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا کر ڈالے ہیں تمہارے منہ میں... تو پھر مجھ سے زیادہ حق کس کا ہے۔ بتاؤ۔"

وہ حق دق رہ گئیں۔ احسان جتاتے سنا تھا' مگر یہ انداز اور بدل میں کیا مانگ رہی تھیں۔ ان کی نظریں اللہ دتا ریاض پر ٹک گئیں۔ سانولا' پرکشش' دبلا پتلا لڑکا جس کی آنکھوں میں ذہانت کی گہری چمک تھی' مگر ایک لو جو بہت مدھم تھی وہ سمیرا پر نظر پڑنے سے جھلملاتی تھی۔

"اوہ..." انہوں نے لمبا سانس لیا' ماں اور بیٹا ہم خیال تھے ان کی نگاہ سمیرا پر اٹھ گئی۔ وہ اسی محفل کا حصہ تھی' مگر ذرا پرے ہو کر اس گولڈ میڈل کو دیکھ رہی تھی جو اللہ دتا ریاض لایا تھا۔

وہ اللہ دتا کی بہنوں اور حمیرا کے ساتھ محو گفتگو تھی۔ بچوں کا دھیان نہیں تھا ہاں' مگر وہ اللہ دتا کے آنکھوں کی جھلملاتی روشنی... اور بھولی کا لجاجت آمیز انداز... وہ باقاعدہ جھولی پھیلا چکی تھی۔ صفیہ کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ ان کے اعصاب تن گئے۔ عبدالعزیز نے بھولی کی جھولی کو سمیٹ دیا اور بندھے ہاتھوں کو نرمی و احترام سے کھولتے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے۔

"ابھی ان باتوں کا وقت نہیں ہے' بھولی آپا... بچوں سے بھی پوچھنا پڑتا ہے اور پھر۔"

"تو پوچھنے کا کیا مطلب میرا اللہ دتا راضی ہے کیوں اللہ دتا؟" بھولی نے اللہ دتا کا ہاتھ جھپٹ کر جھنجھوڑ دیا۔

"جی... جی اماں...!" وہ گڑبڑایا اور اثبات میں سرہلا دیا اب پتا نہیں ماں کی پکار کا جواب دیا تھا یا ہاں کہی تھی۔ بڑی امی نے سرہاتھ پر گرالیا۔ بھولی نے ذرا توجہ نہ دی (وہ بھائی سے مانگ رہی تھی' بھابھی کا کیا ہے؟ بڑی آئی شہرن)

ادھر عبدالعزیز انکاری نہیں تھے ان کے انداز کی لچک سے پتا چل رہا تھا' مگر وہ ہاں کے بھی نہیں دیتے تھے۔

"اچھا چل ٹھیک ہے۔" بھولی نے ہاتھ اٹھا دیے۔ "تو باقاعدہ اعلان نہ کر' مگر یہ کہہ دے کہ تیری بیٹی پر پہلا حق میرا ہے۔"

"میں کیسے؟ کیا مطلب؟" عبدالعزیز نے بیوی اور بھاوج کو دیکھا۔

"جب بھی تو بیٹی بیاہنے لگے گا' پہلے مجھ سے پوچھے گا۔"

"اوہ!" بڑی امی کا چہرہ پرسکون ہو گیا۔ بھولی سے اتنی عقل مندی کی امید نہیں تھی۔ تھوڑا سا متوازن رویہ... درمیانی راستہ شکر... اور ان کے چہرے پر پھیلا سکون شوہر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہا۔

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ "مگر ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟" سب ہی چونک اٹھے۔

"جب وقت آئے گا تب کے حالات' بچوں کی پسند دونوں کا ایک دوسرے کے لیے مناسب ہونا' سب چیزیں دیکھتے ہوئے بات کی جائے گی۔"

"ہاں جی اس میں شرط کی کیا بات ہے۔" بھولی نے

لمحوں میں مان لیا۔

سب کچھ ٹھیک ہوگیا تھا' مگر اس کا کیا کرتے کہ بھولی نے اگلی صبح ہی اس بات کو سارے خاندان محلہ جان پہچان والوں سب میں پھیلا دیا۔ شرط بھی بتادی اور یہ بھی کہہ دیا میرا بیٹا اتنا قابل ہے وہ مامے کی ساری شرطوں پر پورا اتر جائے گا اور یہ کہ "میرے اللہ دتا کو ناپسند کر کون سکتا ہے۔ شہزادہ ہے میرا پتر... اور قابل اتنا کہ حکومت پیسے خود گھر بھیج رہی ہے۔"

وہ شوہر کو دیکھ کر رہ گئیں۔ دیگ کا ایک دانہ چکھتے ہیں وہ ڈھائی سالوں میں انہیں اللہ دتا ویسے بھی اچھا لگا تھا۔ سلجھا ہوا' تمیزدار لڑکا جسے صرف اپنی پڑھائی اور ماں کی تابعداری سے مطلب تھا۔ وہ یا تو پڑھتا لکھتا پایا جاتا یا پھر ماں' بہنوں کے بنائے کڑھائی بنائی کے نمونوں کو سائیکل پر مطلوبہ جگہ تک پہنچا کر آتا (پھپھی بھولی کو بوتیک سے آرڈر ملنے لگے تھے۔ شہر آکر ان کے ہنر کو چار چاند لگ گئے تھے۔ گاؤں کے ماسٹر جی نے بالکل درست مشورہ دیا تھا)

مگر ایسے کیسے چودہ پندرہ برس کی لڑکی جو کھیل تماشوں سے نکل کر اب پڑھائی لکھائی میں داخل ہو رہی تھی۔ اسے ایک نئے رشتے سے متعارف کروا دیا جاتا جبکہ ان کے سمیرا کے حوالے سے بہت سے خواب تھے' اعلا تعلیم' خودمختار ہو بلکہ ملازمت بھی کرے' اپنے پیروں پر کھڑی ہو اور ایسے میں اگر دماغ میں پہلے ہی خناس بھر جائے تو...

انہوں نے شعوری کوشش سے اسے ہمیشہ یہ باور کروایا کہ یہ ایک بات ہے اسے سر پر سوار کرنے کی قطعاً" ضرورت نہیں' دل میں لانے کا تو سوال ہی کیا؟ اور سمیرا کا ٹارگٹ... صرف اپنی تعلیم ہونا چاہیے اور ہر چیز اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے اور... اور... اور... سمیرا ماں کے خیالات و نظریات سے واقف تھی۔

خود اس کے اپنے دل میں بھی بہت سارا پڑھنے اور قابلیت حاصل کرنے کا شوق تھا۔ (وہ پڑھائی میں اچھی تھی اور کچھ خاص پڑھنا چاہتی تھی' نام کمانا چاہتی تھی) مگر پڑھائی کے شائق دل کے اندر سانولے چہرے اور سیاہ گہری آنکھوں کی چمک نے ایک درز بنادی' ذرا سا روزن... روزن شگاف بن جاتے ہیں۔

اور بات اگر دل کی ہو تو... درزیں... دروازے ہو جاتی ہیں اور دروازے شاہراہ بن جاتے ہیں جہاں محبت شان سے چہل قدمی کرتی ہے۔ محبت کی شاہراہ کے دونوں اطراف گھنے درخت اگ آتے ہیں اور جن پر انوکھے رنگوں کے پھول کھلتے ہیں' انجانی مسحور کن خوشبوئیں اٹھتی ہیں' قدموں کے نیچے پھول بچھ جانے کا گمان ہوتا ہے' تاحد نگاہ رنگ... چہچہاہٹیں' گنگناہٹیں...

اور یہی سب سمیرا کے ساتھ بھی ہوا... کب ہوا۔ پتا ہی نہ چلا' لیکن ماں کے خیالا' تربیت' ماحول' مزاج کا حصہ بن گئے تھے۔ اظہار بھی نہیں ہوا نہ کوئی چوک... مگر اک نگاہ کی چوری... ایک مسکراہٹ دبی دبی سی... ایک خوشی جو دل میں یوں پھوٹتی تھی جیسے برسات میں کبھی... خود رو بوٹی... جگنو کا لپکا... پل بھر کو۔

اتنا سب ہوگیا۔ سمیرا کو پتا ہی نہ چلا۔ دل کی دھڑکن۔ اے ڈی ریاض کے نام کی محتاج ہوگئی۔ ہائے... خدا دشمن کو بھی اس تکلیف سے دور رکھے۔ وہ سوچتی تھی' پہروں' گھنٹوں... راتوں کو جب نیند دور کھڑے ہو کر للچاتی تھی۔

اور بڑی امی... وہ ماں تھیں' بیٹی کی آنکھ کا رنگ نہ پہچانتیں تو کس بات کی ماں...

اور کتنا وقت گزر گیا تھا ان سب باتوں کو... اب تو وہ وقت بھی گزر گیا تھا جو عبدالعزیز نے طے کیا تھا۔ پسندیدگی' مناسبت... حالات' وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے یوں مناسب تھے جیسے سرخ کے ساتھ سنہرا رنگ' پسندیدگی ایسی تھی جیسے چاند کے گرد چکوری... برسات کے لیے مورنی کی دیوانگی جیسی... ہاں... مگر... حالات... حالات پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ لیکن حالات کا رونا ان کی طرف سے تو تھا پر پھپھی بھولی کی طرف تو نہیں تھا۔

ان کا بیٹا ان کے گمان کی حد سے زیادہ قابل و

کامیاب نکلا تھا۔ سارے ولدڑ دور... وہ بیٹیوں کو بالخصوص اے ڈی سے چھوٹی والی سکینہ مبہنہ کو پہلے بیاہنا چاہتی تھی۔ آج انہیں اپنے گھروں کا ہوئے ہوئے بھی سالوں کی گنتی ہونے لگی تھی۔

بڑی امی کو بھی چار کنواری نندوں کے سر پر بیٹی نہیں بھیجنی تھی۔ اچھا ہوا وہ صحیح وقت پر عزت سے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔

لیکن اب تو بھولی نے نمبر تین والی ذکیہ کی دن تاریخ بھی رکھ دی تھی اور عطیہ کی بات بھی طے ہو گئی تھی تو... اللہ دتا ریاض کب تک... اب بھولی کے لیے کیا امر مانع تھا۔

وہ خود تو کیا... عزیز رشتے دار بھی ان سے اور بھولی سے پوچھنے لگے تھے پر بھولی چپ تھی انہوں نے بہت دیر سے سہی، مگر نوٹ کرنا شروع کر دیا تھا بھولی کے انداز کی محبت تو پہلے جیسی ہی تھی، مگر... وہ رشتے کے حوالے سے بات نہیں کرتی تھی شاید... عبدالعزیز کی تنبیہہ یاد ہو۔

"وقت آنے پر..."

مگر... پہلے تو وہ وقتاً" فوقتاً" کسی نہ کسی انداز سے کوئی جملہ ایسا کہہ دیتی تھی جو "رشتے" کو نمایاں کرتا تھا۔ لیکن...

اور یہ سب اس وقت بھی شوہر سے کہنے کے بعد وہ چاہتی تھیں وہ خود بھولی سے بات کریں کہ کب... کوئی اشارہ کوئی پیغام۔

"وہ کہہ رہی تھیں، گھر بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔"

"تو یہ اچھی بات ہے۔" ان کا دل مضبوط ہوا۔

لیکن مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے لہجے کی بے ساختگی اور سادگی میں سچائی نہیں لگی۔"

"تمہیں ہمیشہ سے ان کے انداز پر اعتراض رہے ہیں۔"

"وہ اپنی جگہ درست ہے... خیر۔ گھر والی بات بھی درست ہے، مگر یہ گھر کب تک بنے گا؟" انہوں نے خود کو انتظار کے لیے تیار کیا۔

"بن جائے گا، گھر بنانا کوئی آسان کام ہے۔"

عبدالعزیز نے حقیقت پسندی سے کام لیا۔

☆ ☆ ☆

کتنی بڑی خوشی کا دن تھا ناہید کے لیے... ان کا بیٹا آج کالج کے لیے نکل رہا تھا اتنی خوشی تو اس دن بھی نہیں ہوئی تھی جس دن اسے پہلی بار نرسری کلاس کے لیے تیار کیا تھا جتنی کہ آج۔ ایکسیڈنٹ کے بعد زندگی کی امید نہیں تھی... زندگی کے بعد بحالی کی اور بحالی کے بعد دوبارہ فعال ہو جانا تو اس وقت دیوانے کا خواب لگتا تھا کیا وہ دوبارہ زندگی کو جی سکے گا۔ ویسے جیسے کہ زندگی کو جینے کا حق ہے یا طریقہ ہے اور آج اس خواب کی طرف اس کا پہلا قدم تھا۔

ہاں وہ ہم اپنے عمروں سے، ہم جماعتوں سے پیچھے رہ گیا تھا، لیکن کوئی بات نہیں... زندگی شرط ہے۔ نمبروں کا کیا ہے، آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں۔

وہ اس کے لیے ڈھیر سارے ناشتے کے لوازمات سجائے بیٹھی تھیں اور وہ کتنا پیارا لگ رہا تھا شہزادہ؟ لیکن نہیں شہزادے عام شکل و صورت کے بھی تو ہوتے ہیں۔ ان کا بیٹا یوسف ثانی لگ رہا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے یہ ان کے دل کی گواہی تھی۔

بس ایک بار جسم پر بوٹی چڑھ جائے۔ وہ اب بھی بہت دبلا سوکھا تھا، لیکن پیلا پن ختم ہو گیا تھا چار سال کی بیماری... لاچاری... میٹرک کا رزلٹ نکلا تھا، وہ خوشی میں دوستوں کے ساتھ بائیک لے کر نکل گیا تھا اور کبھی بھی وہ چھچھورا نہیں تھا، مگر نجانے کیسے موٹر سائیکل کی اسپیڈ زیادہ ہو گئی اور اور... اس کے بعد بائیک ایسے پچکی ملی تھی جیسے کاغذ کی بنی تھی اور کسی نے کاغذ کو ہاتھوں سے نچوڑ دیا ہو اور سوار... اوہ خدا...

ناہید نے جھرجھری لی۔

مگر آج ان کا بیٹا دوبارہ سے عملی زندگی میں قدم رکھ رہا تھا۔ قدرے سست رفتار سہی، مگر جیت بھی تو کچھوے کو ملی تھی تو طے ہوا برق رفتاری اتنی بھی بڑی خوبی نہیں۔

"میں جہاز تو نہیں اڑا سکا امی!" وہ دروازے تک

اسے خدا حافظ کہنے آئی تھیں۔ آج پہلے دن ابو نے پک اینڈ ڈراپ کی اسپیشل سروس فراہم کی تھی۔

"لیکن جہازوں کو زمین پر سے کنٹرول کرنے والا افسر ضرور بن کر دکھاؤں گا۔"

"سچ...!" ناہید کی آنکھیں چمکیں۔

"سچ...!" اس نے اپنے ہونٹ ماں کی پیشانی سے چپکا دیے۔



"کتنی دنوں بعد سورج نے شکل دکھائی ہے۔ ورنہ زندگی ایک رضائی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔" اتنی گہری بات حمیرا امجید کے علاوہ اور کون کہہ سکتا تھا۔

شدید دھند نے ساری زمین کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ سردی کے کیا کہنے... سارا شہر سی سی، ہی ہی، ہو ہو ہو گیا تھا پر اب جو یہ سورج نکلا نرم گرم سی دھوپ... اتنے دنوں سے چبھتی ہوا میں بھی اب شرارت کے موڈ میں تھیں، وہ دونوں موسم کی اس نئی ترنگ سے لطف اٹھانے کے لیے چھت پر چلی آئی تھیں، ساتھ میں کنوؤں کی ٹوکری بھی لائی تھیں۔ پیچھے پیچھے دونوں کی امیاں بھی آگئیں اور وہ کوئی اکیلی نہیں تھیں۔ تقریباً ہر گھر کی چھت پر عورتیں موجود تھیں۔ دھوپ سینکی جا رہی تھی، سبزی بن رہی تھی۔ ہر چھت کی منڈیر پر لحاف ڈال دیے گئے تھے بستر بھی دھوپ مانگنے لگے۔

"او خدا...!" حمیرا نے دونوں ہاتھ آپس میں بھینچ کر جیسے سورج کی بلائیں لیں عین اس کے سامنے یہ بڑا روشنی کا منبع... پیروں سے موزے اتار کر وہ ننگے پیر سورج کی سمت منڈیر تک آگئی۔

"کہاں تھے تم اتنے دنوں سے...؟ ہر روز اس امید پر چھت پر آتی تھی کہ تم ملو گے، مگر تم نہیں ملے۔ دھند سے ڈر کر ایسا بھاگے۔ مئی جون میں تو بڑی مردانگی جھاڑتے ہو۔ دسمبر جنوری میں کیا بزدل ہو جاتے ہو میرے آفتاب..."

وہ سورج سے ہم کلام تھی۔ دونوں بانہیں ٹائی ٹینک کے ہیروئن انداز میں وا کرلی تھیں۔ چہرہ سورج کی طرف کیے وہ رو ٹھی محبوبہ کی طرح شکوہ کناں تھی۔

صفیہ نے سر پر ہاتھ مارا۔ اگر کوئی سن لے تو کیا کہے صفیہ کی بیٹی کا کس آفتاب سے چکر ہے جسے وہ ایسے ایسے طریقے سے پکارتی ہے کہ سر شرم سے جھک جائے۔

بڑی امی کھلے منہ سے سن رہی تھیں وہ ایک گدا لیے نیچے بیٹھی تھیں ڈورے ڈالنے تھے۔ سمیرا نے پلیٹ بھر کے کنو چھیل لیے تھے۔ وہ حمیرا کے پاس چلی گئی پر حمیرا نے دھیان نہ دیا۔ وہ ہم کلام ہونے کے اس مرحلے میں تھی جہاں سے ہم کو خود ہماری خبر نہیں آتی۔

"اس سے یہ بھی کہو اس کے ہجر نے ہمیں سوکھی لکڑی کی طرح چٹخا دیا تھا۔ سارا روپ رتن کھو گیا؟" سمیرا نے پھانک منہ میں رکھی اور اپنے ہاتھ کی جلد دکھائی لاکھ احتیاط کے باوجود سخت سردی نے ساری نمی چھین لی تھی۔

"ہاں۔" حمیرا نے سن لیا، مگر گردن نہ موڑی۔

"سارے سر میں خشکی بھی ہو گئی۔"

"بالکل ٹھیک..." سمیرا نے سراہا۔

"میں سورج مکھی ہو گئی تھی میرے ندیم... نہ تم نکلے نہ میں... نکلی میرا مطلب ہے کھلی۔"

"ابھی تو تم آفتاب کہہ رہی تھیں۔" سمیرا نے ٹوکا۔

"ہاں ہاں میرے آفتاب..."

"اسے یاد کروا دو بائیں والے پڑوسی کا نام ندیم ہے۔ ابھی اس کی بیوی دندناتی ہوئی پہنچ جائے گی اور دائیں والے کے دادا کا نام چوہدری آفتاب ہے۔ کہیں وہ خود ہی گرتا پڑتا نہ آجائے کہ دھیوں مینوں کنے سوبا۔" (بیٹیوں مجھے کس نے بلایا)۔

سمیرا کے منہ سے کینو کے بیج پھو کر کے نکلے اس نے بمشکل خود کو اچھو لگنے سے بچایا تھا۔ اپنی امی سے ایسی بذلہ سنجی کی امید نہیں تھی۔

جبکہ صفیہ کے صبر کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ذرا جھک کر اپنے پیر سے جوتی اتاری۔ ٹھاہ... دوسری ٹھاہ... اور

ساتھ ہی حمیرا کی ہائے۔ اور پھر ہائے ہائے۔ ماں نے مغرب کی طرف سے جو تابڑ توڑ برسایا تھا اور نشانہ کیا خوب تھا سیدھا کمر پر۔۔۔

"کوئی اپنی بیٹی کو ایسے مارتا ہے، لے کر میری ریڑھ کی ہڈی ہلادی ہائے میری کمر۔۔۔"

"کمر نہیں کمرہ۔۔۔ بلکہ پورا ایک کلہ (ایکڑ)۔" صفیہ کی جان جل کر خاک ہو چکی تھی۔ حمیرا کی پشت اس کے سامنے تھی۔ سمیرا اس کے پیچھے ذرا سا جھکی قمیص میں ہاتھ ڈال کر شانے والی جگہ کو سہلا رہی تھی۔ اس کی لمبی چوٹی آگے آکر گر گئی۔ اس کی نازک کمر یا۔۔۔ ایک بالشت سے کیا زیادہ ہوگی اور وہ۔

"حمیرا۔۔۔" صفیہ نے دانت پیسے۔ حمیرا قطعی موٹی نہیں تھی، مگر سمیرا کے آگے لگتی تھی اور سمیرا اللہ کے بنائے ان چند لوگوں میں سے تھی جس کے آگے باقی سب پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔

"امی کا بس چلے تو مجھے چھری لے کر چھیلنا شروع کردیں۔ یہاں سے کم یہاں سے زیادہ۔" حمیرا نے لمبی چھوڑی۔

"تو اپنے آپ کو تم نے دیکھا ہے۔ خمیری روٹی کی طرح پھولتی جارہی ہو۔"

"آپ مجھے بڑا بھی کہہ سکتی تھیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" صفیہ کی ناراضی کے پیش نظر سمیرا نے گھورا حالانکہ متبسم چہرہ گدگدی کی ترجمانی کررہا تھا۔

"تھوڑی ماڈرن لک آجاتی یار۔۔۔!" اس بار تو بڑی امی کی ہنسی بھی نکل گئی پھر صفیہ کی سنجیدگی کو دیکھ کر فوراً گدے پر جھک گئیں۔

"اپنا جسم سنبھال لو حمیرا۔۔۔" صفیہ کی دھمکی فیصلہ کن تھی۔

"رہنے دو صفیہ۔۔۔! اتنا مت ٹوکو۔۔۔ اس عمر میں بچیاں ایسی ہی ہوتی ہیں دو چار سال گزریں گے تو خود بخود متناسب ہوجائے گی۔ کالج کی پڑھائی کی محنت سب کھایا پیا جلادیتی ہے۔"

بڑی امی کا تجزیہ و تبصرہ بالکل درست تھا، صفیہ کہاں کسی کی سنتی تھیں۔

"بس ہوگیا فیصلہ۔۔۔ تم کل صبح سے واک پر جاؤگی۔"

"ٹھیک ہے، چلی جاؤں گی۔" حمیرا نے سرہلایا۔

"سامنے والے پارک میں نہیں۔" صفیہ کی نگاہیں اپنی حد نظر پر جمی تھیں۔

"تو پھر کہاں؟" حمیرا چونکی۔

"وہ۔۔۔ وہ جو سامنے درخت نظر آرہا ہے۔"

"سامنے؟" حمیرا نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے تو کوئی درخت نہیں تھا۔ سامنے آسمان پر سورج تھا یا پھر کھیت۔۔۔ دراصل یہ ان کے گھر کا پچھلا حصہ تھا چوڑی گلی اور پھر باؤنڈری وال جو کھیت اور رہائشی علاقے کو الگ کرتی تھی۔ یہاں تو کوئی درخت نہیں تھا۔ کپاس اتاری جاچکی تھی۔ کھیت میں جگہ جگہ کپاس کے سوکھے پودوں کو کاٹ کر جلانے کے لیے گٹھڑ کی صورت جمع کیا گیا تھا۔ کہیں کہیں جانوروں کے لیے ہٹھے (گائے بھینسوں کی خوراک) لگے تھے یا پھر سرسوں کے پودے۔۔۔ درخت کہاں تھا۔۔۔ حمیرا نے ماں کی انگلی دیکھی۔ پھر اشارے والی جگہ پر۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔ وہ اف۔۔۔ اف۔۔۔ او درخت ہائے اس کے دل پر ہاتھ پڑا، بے یقینی سے ماں کی صورت دیکھی، سمیرا ابھی ہنس رہی تھی۔ اسے درخت نظر آگیا تھا۔

"جو درخت مجھے نظر اتنی مشکل سے آرہا ہے میں اس تک جاؤں گی کیسے۔" اس نے دہائی دی۔

"ہائے۔۔۔" اسے غش آگیا۔ سمیرا کے کندھے پر جاگری۔ اب ہائے کرنے کی باری سمیرا کی تھی۔

"اتنی دور کیوں بھیج رہی ہیں، پارک ٹھیک ہے نا۔" سمیرا نے صفیہ کو دیکھا۔

"وہاں جاکر یہ بنچ پر بیٹھ کر آجاتی ہے۔ یہاں سے میں اسے مسلسل دیکھوں گی۔"

"اوہ!" حمیرا کے ڈیلے باہر کو ابلے۔ کیا امریکی تھنک ٹینک سوچتے ہوں گے جیسی دور کی کوڑی صفیہ لائی تھیں۔

"اتنی ٹینشن مت لیں صفیہ چچی۔۔۔ اسے میرے

ساتھ صبح واک پر بھیج دیں' میں اسے کہیں بیٹھنے نہیں دوں گا۔'' اوپر آتے معید نے تھوڑی بہت گفتگو سن لی تھی' اپنی خدمات پیش کردیں۔

حمیرا کے چہرے کا رنگ واپس لوٹا۔ فوراً ''جاکر اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

''یہ ٹھیک ہے۔ میں معید کے ساتھ چلی جایا کروں گی۔''

بڑی امی اور سمیرا نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ کیسے فوری مان رہی تھی وہ۔

''نہیں....'' صفیہ کی آواز ابھری۔ ''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''میں روز جاتا ہوں.... یہ بھی چلی چلے۔'' معید نے وضاحت کی۔

''میں نے کہانا یہ نہیں جائے گی۔'' حمیرا نے آنکھیں چندی کر کے ماں کو دیکھا۔ ایسے کیوں بولی تھیں وہ.... حرج ہی کیا تھا جب کہ بڑی امی اور سمیرا کا چہرہ پھیکا پڑا تھا۔ معید کے چہرے کے رنگ کو اڑتا دیکھ کر۔



وہ شرم سار سا ماں کے سامنے بیٹھا تھا۔ ابھی کچھ روز پہلے تک ہی تو ان کی آنکھوں میں کچھ خواب بو کر آیا تھا۔ اب کس منہ سے کہتا زمین بنجر نکلی یا تھور زدہ.... وہ پائلٹ نہیں بن سکتا تھا' لیکن کچھ اور ایسا تو بن ہی جاتا کہ ماں کو اپنا خواب پورا ہوتا نظر آجاتا۔

لیکن کیا کیا جائے کہ.... عزم جوان رہا' جسم جواب دے گیا۔ چار سال کے علاج' ورزشیں' کھانے پینے کے بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگا تھا' مگر یہ سر کی چوٹ تھی جس نے کہیں اندر جاکر جگہ بنالی تھی جیسے کھوہ میں ناگ.... اسے سوال سمجھنے مشکل لگ رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے دائرے سے ناچتے' لکھنے لگتا تو نظر لہرا جاتی۔ سر چکرانے لگتا۔ شدید درد ہونے لگتا' چار سال میں پہلی بار وہ خود اکیلا ڈاکٹر کے پاس گیا۔

اور ڈاکٹر نے اپنا خدشہ جو اسے پہلے دن سے تھا' اس کے بہت زور دینے پر بتا دیا۔ وہ سخت دماغی محنت والا کام کبھی نہیں کرسکے گا' اس کا دماغ اتنی مشقت برداشت نہیں کرسکتا اس لیے بہتر ہے کہ وہ دماغی کاموں سے دور رہے۔

''تو کیا دل کی سنوں ڈاکٹر صاحب؟'' وہ مسکرایا۔

''اور دل یہ کہتا ہے ماں باپ کے سارے خواب پورے کرو' میں تو دوراہے پر آگیا جناب....!''

وہ دکھی تھا پر شوخ ہو رہا تھا۔ ایسا ظالم بھی کوئی ہوتا ہے' اذیت پسندی کہتے ہیں اسے عرف عام میں....

اور وہ ماں باپ کو اندھیرے میں رکھ کر ان پر ظلم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے انہیں سب کچھ بتا دیا' ابو مسکراتے رہے۔ گیلی آنکھوں والی مسکراہٹ.... بے بس مسکراہٹ۔

''تو پڑھے گا نہیں تو کیا کرے گا؟'' ناہید نے اپنے آنسو اندر اتار لیے تھے۔ ایک ماتم سب سے چھپ کر.... ایک نوحہ بس زیر لب' ایک گلہ صرف اللہ سے.... اور آخری حد شکر کہ بیٹا جیتا جاگتا سامنے موجود تھا۔

''میں سوچ چکا ہوں امی! یہ بھی....'' اس کی آواز صاف اور لہجہ پر عزم۔ دونوں میاں بیوی چونکے۔

''میں ایک بک اسٹور بناؤں گا۔ شہر کا سب سے بڑا بک اسٹور.... جہاں دنیا کی ہر کتاب میسر ہوگی.... جہاں.... جہاں.... جہاں....''

اس نے خوابوں کی سلائیوں پر خواہش کے نئے ڈورے ڈالے.... منفرد بنائی' اچھوتا ڈیزائن.... خوش رنگ.... جیسے قوس قزح.... ماں باپ کی دنیا پھر جگمگانے لگی۔



''سرہانے کے لحاف سا.... اس کا ہم قافیہ بتاؤ۔'' حمیرا کاغذ قلم لیے بیٹھی تھی۔

''کیوں اس کا کیا کرنا ہے؟'' سمیرا اپنے پیر کے ناخن سجا رہی تھی۔

"کچھ نہیں اس سے تحریر میں خوب صورتی آتی ہے۔" حمیرا نے پین کا سرا دانتوں میں دبایا۔

"تم نے دیکھا ہے نا سمیرا احمید کتنی خوب صورت قافیہ آرائی کرتی ہے۔"

"سمیرا احمید...؟" سمیرا عزیز چونکی۔ "سمیرا احمید کا تم سے کیا مقابلہ..."

"کیوں نہیں بھئی۔" حمیرا نے پین رکھ کر جارحانہ انداز بنایا۔ "میرا اس کا مقابلہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ جب کہ اس کے اور میرے نام کا قافیہ بھی ایک ہے۔ وہ سمیرا احمید... میں حمیرا امجید..."

"سرما کے لحاف سا' سرما کے لحاف سا' سرما کے۔ تکیے کے غلاف سا۔" سمیرا کے منہ سے یک دم نکلا۔

"ان دو باتوں کا آپس میں کیا تعلق..." حمیرا نے ہیرو کی صفات لکھنی تھیں اب ہیرو لحاف تو ہو سکتا ہے "مگر کیا غلاف بھی (وہ بھی تکیے کا) اونہوں۔"

"کیوں نہیں ہے تعلق...؟" سمیرا نے اپنا کام چھوڑ کر اسے اپنی پوری توجہ سے نوازا۔ "سرما میں لحاف ضروری ہے تو تکیے کا غلاف بھی ضروری ہے۔ بلکہ امی کہتی ہیں عورت کا سلیقہ ان ہی چیزوں سے پتا چلتا ہے۔"

"سمیرا کی بچی میں ناول لکھنا چاہتی ہوں۔ ہیرو کو تکیے سے ملادوں' تمہارا دماغ ہے کہاں؟" حمیرا کو اپنا ہیرو یاد آنے لگا۔ ہیرو تکیہ۔

"اوبی بی...!" سمیرا نے ہاتھ نچایا "تم تکیے کو اتنا ہلکا بھی نہ لو تکیہ بھی ادب کا حصہ ہے۔"

"جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔"

"تو اس ذرا سی بات پر تکیہ ادب کا حصہ ہو جائے گا؟" اس کا دل انکاری تھا۔ یا شاید تکیے کی اتنی عزت افزائی پسند نہیں آئی۔ اس کے ہونق کھلے منہ سے پرے سمیرا اپنی ہی کہہ رہی تھی۔

"تکیوں پر شعر کڑھائی کیے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے شعرا نے اپنے تکیوں کا ذکر کیا ہے۔"

حمیرا نے طنزیہ نگاہوں سے اسے گھورا۔

"کون سا شعر...؟" حمیرا کو کچھ یاد نہیں تھا۔

"وہی..."

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

"اس میں تکیہ کہاں ہے؟" حمیرا کے منہ سے نکلا۔

"میر کے سر کے نیچے۔" سمیرا نے ترنت کہا۔

"نہیں واقعی؟" اس کی آنکھیں آخری حد تک کھل گئیں۔ واقعی سمیرا کی معلومات حیران کن تھیں۔ سمیرا نے اپنی ہنسی کا گلا گھونٹا اور بے حد سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"ویسے بائی داوے اگر تم کو تکیے پر شعر کاڑھنے کے لیے دیا جاتا تو تم کیا لکھتیں۔"

حمیرا کو سوال بہت پسند آیا تھا۔

"اوں..." وہ ٹھوڑی کے نیچے مٹھی ٹکا کر سوچنے لگی۔

"آں ہاں..." اس کا چہرہ جوش سے سرخ ہو گیا۔

دھیرے دھیرے آیا دل دھیرے دھیرے
میرا بلبل سو رہا ہے شور نہ مچا

"اس میں تکیہ کہاں ہے۔" سمیرا چلا اٹھی۔

"اس پر بلبل نے سر رکھا ہوا ہے نا۔ یہ گہرائی کی باتیں ہیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔" اس نے سمیرا کو کہا اور بے نیازی سے کاغذ پر کچھ لکھا۔

سارے صوبے کے انٹر کے لڑکے لڑکیاں امتحان دینے کے بعد فارغ تھے۔ پاگل صرف یہی ایک ہوئی تھی جس کی بوریت کا علاج نہ تھا۔

حمیرا نے پھولے منہ کے ساتھ کاغذ قلم پھر اٹھا لیا اور رخ بھی پھیر لیا۔ وہ خود ہی قافیہ جوڑے گی۔ بڑی اہل علم بنتی ہے' لے کر ساری کہانی بھلا دی۔

"ویسے تم نے اچانک رائٹر بننے کا سوچا کیوں؟"

"بس میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔

"گھر کے کام کر لیا کرو' وہ بھی بہت ہے۔"

"تم چاہتی ہو میں ماسی بن جاؤں۔"

"گھر کے کام کرنے سے کوئی ماسی نہیں بنتا۔ موٹی ہو رہی ہو' ست الوجود۔"

"کیا..." وہ کرنٹ کھا کر گھومی۔ "اب تم میرے نوالے گنوگی۔"

"نوالے..." سمیرا نے کہا۔ "نوالے نہیں روٹیاں... بلکہ پلیٹیں پراتیں..."

"سمیرا!" وہ دھاڑی۔

"حمیرا!" اس نے بھی یہی انداز اپنایا۔

"تم چلی جاؤ یہاں سے سمیرا... اور اپنا یہ سامان بھی لے جاؤ۔" اس کا ضبط جواب دے گیا۔

"ٹھیک ہے۔" سمیرا نے تابعداری سے کہا۔ "مجھے بھی مغز خالی کرنے کا شوق نہیں۔"

"اے سی بھی چلا دو..." اس کی آواز بھی ناراض تھی۔

"اے سی...؟" سمیرا نے دہرایا۔

"ہاں اے سی... ادب پیدا کرنے کے لیے پرسکون ماحول درکار ہوتا ہے، مگر یہ بات تمہیں کہاں پتا ہوگی۔"

"پرسکون ماحول..." سمیرا نے دانت کچکچائے۔ "پہلے اپنے اندر تو ادب پیدا کرلو۔" سمیرا کو غصہ آہی گیا۔ دھپ سے دروازہ کھولتی کھٹ سے بند کرتی باہر نکل گئی۔

"کوئی بات نہیں سمیرا کی بچی..." اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ "میں تمہیں اب خود ہی ناول لکھ کر دکھاؤں گی، سمجھیں..."

اس نے ایک نئے جوش و جذبے سے کاغذ قلم اپنے سامنے کیے۔

"ہیرو کی صفات... سرما کے لحاف سا... اس سے آگے... اس سے آگے تو کیا لکھ دوں تکیے کے غلاف سا..." بے چاری عجب مشکل میں پڑ گئی۔ "اچھا لکھ دیتی ہوں۔ اگر غلط ہوگا تو ایڈیٹر خود ہی کاٹ دے گی۔ آخر اسے بھی تو کچھ کرنا چاہیے نا؟ تنخواہ کس بات کی ملتی ہے۔ ویسے بھی ایڈیٹر کو کچھ نہ کچھ تو کاٹنے کے لیے ملنا چاہیے ورنہ اسے ایڈیٹر کون کہے گا۔"

"چلو جی...!" اس نے لکھ کر قلم کو یوں لڑکھڑایا جیسے قلم توڑ دیا۔

"اتنے حسین الفاظ واہ جی واہ۔"

ایسا غرور اور بے نیازی تو فیض نے نسخہ ہائے وفا لکھ کر بھی نہ دکھائی ہوگی۔ دیکھنے والے اش اش کر اٹھتے، مگر اس وقت کوئی دیکھ نہیں رہا تھا۔ ہاں دو گھنٹے بعد جب سمیرا کسی کام سے اندر آئی تو کڑچ کی آواز پر بدک کر پیچھے ہٹی۔

"اوہ!" اس کے پیروں کے نیچے آکر پین ٹوٹ چکا تھا۔

"اور کاغذ...؟" سمیرا کی متلاشی نگاہیں حمیرا پر جاکر رکیں جو اوندھی سو رہی تھی۔ گال بیڈ کے سرے پر ٹکا تھا لمبا ہاتھ نیچے تک لٹک رہا تھا۔

"او خدا...!" سمیرا نے سر پر ہاتھ مارا۔ "ڈھیر سارے لکھے کاغذ۔ مگر محترمہ اپنے لکھے پر چڑھ کر بے سدھ سو رہی تھیں۔

کاغذ کچر مچڑ گیا تھا۔

"اب کیا ایڈیٹر پہلے کاغذ کو استری بھی کرتی۔"

حمیرا مجید جیسے رائٹر ہوں تو ایڈیٹر کے کمرے میں کاغذ قلم اور قینچی کے ساتھ استری بھی رکھنی پڑ جائے۔ قسم سے۔



"کہاں کی تیاری ہے؟" سمیرا نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ صاف کپڑے پہنے تھے، چوٹی کا انداز ہی بتاتا تھا۔ صفیہ کے ہاتھ لگے ہیں۔ یہ بڑا ماتھا... کھنچی کورین آنکھیں۔

"پھپھی بھولی کے گھر جا رہی ہوں اور اپنے نصیب کہاں۔" وہ زود رنج دکھائی دینے لگی جبکہ سمیرا بری طرح چونکی۔

"کیوں...؟"

"ذکیہ، عطیہ سے فیبرک پینٹنگ سیکھوں گی۔"

"فیبرک پینٹنگ؟" سمیرا نے دہرایا۔ "اوہ... تو کیا بناؤ گی؟" اسے دلچسپی پیدا ہوئی۔

"اپنے جہیز کی بیڈ شیٹس، کشن کور، تکیہ کور، صوفہ کور... پنکھا کور، کوم کور... میز پوش، دستر خوان..."

"با...س... بس...." سمیرا کی آنکھیں پھیلیں۔
"اتنے سارے کورس... اور یہ جمپ بیچ میں کہاں سے آگیا؟"
"فیبرک میں مہارت کے بعد میں مشینی کڑھائی سیکھوں گی۔" حمیرا رٹو طوطے کی طرح شروع ہوگئی تھی۔ "اس کے بعد کروشیا کا سیٹ بنے گا.... میں ہی بناؤں گی۔ اس کے بعد چار سوتی ٹانکا لازمی ہے کہ امی کو پسند ہے اور اس کے بعد سندھی ٹانکا اس کے بعد بلوچی اور اس کے بعد...."
"تمہارا گھر ہوگا یا کلچر ہاؤس آل پاکستان ٹانکا ورائٹی؟" سمیرا کا سوال فطری تھا۔
"کلچرل ہاؤس۔ ایک کونے میں بیٹھ کر چرخا کاتتی میں بھی کہیں نظر آجایا کروں گی۔"
"کمال ہے۔ صفیہ چچی کو کیا ہوا؟"
"میں نے بھی یہی پوچھا تھا امی آپ کو کیا ہوگیا ہے۔ بولیں۔ "چپ، تم کو سوال کرنے کو کس نے کہا ہے۔"
"لیکن ان ہنگامی فیصلوں کی وجہ؟"
"وہی.... میری فراغت۔"
"مگر تم تو کہانی لکھ رہی تھیں ناں.... وہ کیا ہوئی؟"
"ادھوری رہ گئی۔ امی کہتی ہیں یہ کیسا فضول کام چنا ہے۔ کرسی پر گھنٹوں کے لیے بیٹھ جاؤ۔ اور موٹی ہوجاؤ گی۔"
"تم فکر مند نہ ہو...." اس نے ہاتھ پکڑ کر حمیرا کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔ "جاؤ سیکھ لو فیبرک پینٹنگ..... کپڑے بنائیں گے۔ پیاری پیاری گیس کرتے..... دوپٹے۔ بیڈ شیٹس کو مارو گولا۔"
"ہننہ....!" حمیرا نے ہاتھ چھڑایا.... "کتنے کرتے بنالیں گے۔ ایک یا دو.... یا دس.... آخر ہر چیز کی ایک لمٹ ہوتی ہے۔ فیبرک پینٹنگ کو فیس پینٹنگ میں بدل دوں گی۔ سارے دن گھر میں جوکر بن کر گھوموں گی یا پھر شہر کی ساری دیواروں کا ٹھیکہ لے لیتی ہوں۔ کپڑے رنگ لوں گی۔ منہ رنگ لوں گی۔ پھر سارا شہر رنگ دوں گی۔"

وہ جل بھن کر خاک ہو رہی تھی۔ باہر سے گزرتے معید کے کانوں میں آخری جملے پڑے اس نے اندر جھانکا۔ ترس آمیز انداز لیے سمیرا خفگی سے پھولا منہ حمیرا.... اس نے اندر قدم رکھے۔
"لوگ تمہارا نام بسنتی رکھ دیں گے جگہ جگہ سے پکار پڑے گی۔" رنگ دے بسنتی! موہے رنگ دے بسنتی آ!"
اس نے بھنگڑا انداز سے ٹانگ اٹھائی اور بازو لہرائے.... جوش سا تھا۔ لڑکھڑا گیا۔ سمیرا چلائی۔
"آرام سے.... ادھر کرسی پر بیٹھو۔" اسے بھائی کی برجستگی پر زور کی ہنسی آرہی تھی۔
"ہاں ہاں!" وہ بیٹھا۔ "کیا مسئلہ ہے؟"
حمیرا نے دونوں بہن بھائیوں کو دیکھا۔ ایک دوسرے کی کاپی تھے۔ تیکھی کھڑی ناک.... ایک جیسی آنکھیں.... رنگ و روپ بھی مگر سمیرا کے اندر گلابیت زیادہ تھی۔
اور ایک وہ خود جو پہلے ہی کسی جاپانی کا بچہ لگتی تھی۔ اوپر سے ماں نے بال بھی ایسے کمال کے بنادیے تھے اور اگر وہ واقعی خدانخواستہ موٹی ہوگئی تو.... تب تو سومو پہلوان لگے گی.... ہائے اللہ نہ کرے.... لیکن یہ کڑھائی بھی تو بیٹھ کر کرنی ہوگی گھنٹوں.... اب میں ٹہل ٹہل کر تو ٹانکے بھرنے سے رہی.... پتا نہیں امی کے دماغ میں کیا چل رہا ہے.... انہیں خود بھی شاید نہیں پتا کہ وہ کیا چاہتی ہیں.... اور میں کوئی بری تو نہیں ہوں اتنی پیاری معصوم سی ہوں مگر بس یہ بال اسٹائل میں آجائیں.... تھوڑی توجہ دوں تو ماڈلز والی لک ہے میری.... مگر توجہ کیسے دوں.... امی نے ہی نچا ڈالا ہے.... چار چھٹیاں ہی تو تھیں.... دو آرزو میں کٹ جائیں دو انتظار میں.... مگر امی کو کون سمجھائے۔

☼ ☼ ☼

صفیہ مطمئن ہوئیں تو حمیرا سمیت باقی گھر والوں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ ورنہ فراغت تو مصیبت بن کر حمیرا پر ٹوٹی تھی جیسے....

"اچھا ہے، ہنر سیکھ لے گی، خالی ذہن شیطان کا۔۔۔"
صفیہ نے جٹھانی سے کہا۔
"کیا سیکھ لے گی وہ بھولی آپا سے۔۔۔ سو طرح کے اور طریقے تھے مصروفیت ڈھونڈنے کے تم نے خوامخواہ بچی کے ہاتھ میں سوئی دھاگا پکڑا دیا۔"
"سوئی دھاگے میں کوئی برائی ہے بھابھی؟" صفیہ کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔
"کوئی برائی نہیں ہے۔۔۔ مگر وہ لینگویج کورس کرنا چاہ رہی تھی۔۔۔ کمپیوٹر کورس وغیرہ۔۔۔ تم نے اسے پچاس سال پیچھے دھکیل دیا۔"
"چھوڑیں بھابھی۔۔۔ پڑھائی اس کا شوق ہے اور پھر عمر کم ہے ورنہ میرا واحد مقصد اس کا بیاہ ہے۔۔۔ کوئی اچھا سا بر دیکھ کر ہاتھ پیلے کر دوں۔" صفیہ کے انداز میں بے زاری تھی۔
"یہ تو ہر ماں کا خواب ہوتا ہے صفیہ۔۔۔! اس سے کسے انکار ہے مگر ٹھیک ہے۔ تم بھی صحیح ہو۔"
صفیہ نے رائے محفوظ رکھی۔۔۔ وہ ہمیشہ سے جب دل چاہتا تھا۔۔۔ بات شروع کر دیتی تھیں اور جب دل چاہتا بغیر وجہ کے چپ سادھ لیتی تھیں۔
سمیرا اسکول گئی ہوئی تھی۔۔۔ حمیرا فریم پکڑ کے بھولی کے گھر۔۔۔ معید کالج اور تایا ابو کام پر۔۔۔ دونوں دیورانی جیٹھانی صبح کی فراغت کو کسی ڈرامے سے بہلا رہی تھیں۔۔۔ صفیہ کے انداز و اطوار سے جیٹھانی نے بہت عرصہ پہلے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ وہ ایسے ہی مزاج کی تھیں۔
حمیرا کا بھی جیسے برا وقت گزر گیا تھا۔ اس نے ماں کو بھی خوش کر دیا تھا اور خود بھی خوش ہو گئی تھی بلکہ صاف دیکھا جاتا تو زیادہ خوش تھی۔ صفیہ نے اسے چار پانچ نئے جوڑے بنوا دیے۔ نازک چپلیں بھی لے کر دیں (یہ اور بات ہے وہ انہیں پہننا بھول کر صرف گیارہ نمبر والا پسندیدہ جوتا پہنتی) صاف ستھرا رہنے کی تاکید بھی زوروں پر تھی اور حمیرا کو عمل یوں کرنا پڑ رہا تھا۔ کہ دھمکی دی تھی انہوں نے وہ گندا دیکھنے پر ڈنڈے سے پیٹیں گی اور خود نہلاتے دھلانے لگیں گی۔
وہ روز اپنے بنائے نمونے ماں کو لا کر دکھاتی تو صفیہ خوش ہو جاتیں۔ پھپھی بھولی بھی تعریف کرتی۔ وہ ذہین تھی بہت جلد سیکھ جاتی تھی۔۔۔ ہاتھ تیز چلتا تھا اور جتنی لاپروا مشہور تھی۔ کڑھائی بنائی اور خاص طور پر پینٹنگ میں تو مہارت حاصل کر لی دنوں میں۔۔۔ سب کو خوش کر دیا۔
پھپھی بھولی کے گھر میں سیکھنے والی ڈھیروں لڑکیاں صبح نو سے ایک بجے تک آتی تھیں۔ صفیہ نے حمیرا کو دوپہر تین سے رات گئے تک کا وقت دیا۔ صبح وہ اس سے صفائیاں کرواتی تھیں۔ حمیرا نے لاکھ سر پٹخا۔
"سب تو صبح میں آتی ہیں۔۔۔ میں اکیلی کیوں بیٹھوں؟"
"اکیلی کہاں، ذکیہ عطیہ بھی تو ہوتی ہیں ناں۔ ویسے بھی وہ سب تو شاگرد ہیں۔ تم تو بھتیجی ہو۔"
"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ قائل ہو گئی۔
صفیہ کا دل مطمئن ہو گیا جو کچھ وہ سوچتی تھی جو کچھ دماغ میں چلتا تھا۔۔۔ ایک مدھم سا خیال۔۔۔ ایک خواہش۔۔۔ ایک کسک۔۔۔ ایک فتح بس یوں ہی۔۔۔ ابھی کچھ واضح نہیں تھا۔ دماغ کا حجم ہر انسان کا ایک برابر ہوتا ہے۔۔۔ لیکن خیال اور سوچیں اس کے چھوٹے پن یا بڑے پن کو ظاہر کرتی ہیں۔۔۔ خیال حالات پیدا کرتے ہیں۔۔۔ اور سوچیں تربیت سے پنپتی ہیں یا پھر۔ ظرف کی حد سے۔۔۔
صفیہ کے دماغ سے پرے حمیرا بھی خوش تھی اور وجہ بالکل الگ تھی۔۔۔ اس کے ہاتھ میں سوئی ہوتی۔۔۔ پھول بوٹے بناتی۔۔۔ ذکیہ اور عطیہ بھی کم گو تھیں۔۔۔ پھپھی بھولی کو اپنی سنانے کی عادت تھی۔۔۔ مگر صبح سے بول بول کر شام ڈھلے ان کے سیل بھی ویک ہو جاتے۔ عطیہ ذکیہ سے گفتگو میں مزا نہیں آتا تھا۔ بھرپور دلچسپی تو لیتی تھیں۔۔۔ مگر ان کے خود کے پاس بات بڑھانے کے لیے موضوعات نہیں ہوتے تھے۔۔۔ پھپھی نے انہیں سلیقے کی تربیت کے ساتھ ساتھ ایک بہترین سامع بھی بنا دیا تھا۔۔۔ یوں بھی ان کی

دنیا کا دائرہ محدود تھا۔۔۔۔ ہاں بھائی ریاض۔۔۔۔ یعنی پروفیسر اللہ دتا ریاض۔

حمیرا کی ان سے بننے لگی۔ اسے معصوم شوخ سی حمیرا بہت اچھی لگتی۔۔۔۔ جس کے اندر دنیا کو جاننے کی طلب تھی۔ وہ بھولی بلی کی طرح ان کی علمیت سے بھرپور باتیں آنکھیں کھول کر سنتی۔۔۔۔ گھر میں تایا ابو سے پیار کرتے تھے۔۔۔۔ **معید** سے دوستی تھی۔۔۔۔ مگر ایک ناصح استاد جیسا دوستانہ رویہ نہیں تھا۔۔۔۔ صفیہ زیادہ تر ایک خفا ماں کا کردار نبھاتی تھیں۔ سمیرا اپنی دنیا میں بہت مگن۔۔۔۔ بڑی امی بس ایک ماں تھیں۔ لاڈ پیار کرنے والی ناز اٹھانے والی۔ ان کی اور بھی ذمہ داریاں اور فکریں تھیں۔۔۔۔ ایسے میں بھائی ریاض اور اس کے تعلقات دن بدن مضبوط ہوتے چلے گئے۔ اس کی گفتگو میں ہر بات کے اندر بھائی ریاض کا نام آنے لگا۔۔۔۔ بھائی ریاض نے یہ کہا۔۔۔۔ بھائی ریاض یوں بولے۔۔۔۔ بھائی ریاض یہ اور بھائی ریاض وہ۔۔۔۔ **معید** تک ریاض نامہ سے تنگ آگیا۔

بڑی امی اس کے قصے سننے کی شروع دن سے عادی تھیں۔۔۔۔ اپنی رائے بھی دیتی تھیں۔۔۔۔ مگر اس کا موقع کم آتا۔۔۔۔ حمیرا دراصل ریڈیو بنتی جارہی تھی دن بدن۔۔۔۔ لاکھ بٹن مروڑو، ایک چینل بند ہوتا تو دوسرا کھل جاتا۔

"ہے ناں بڑی امی؟" ذرا سی بھی بے توجہی محسوس کر کے وہ انہیں پکارتی۔

"ہاں ہاں کہتی رہو، میں سن رہی ہوں۔"

اس کی نسبت سمیرا بغور سنتی بھی تھی اور سوال بھی کرتی تھی۔ بلکہ وہ ایک بے حد دلچسپی لینے والا سامع بن چکی تھی۔

ان سب سے پرے صفیہ بہت خوش تھی۔۔۔۔ بیٹی سلیقہ بھی سیکھ رہی تھی یعنی پھپھی بھولی کی نظروں میں مقام بن رہا تھا۔۔۔۔ اور دوسری جانب اے ڈی ریاض کی حمیرا کی جانب بھرپور توجہ۔۔۔۔ اور حمیرا کا جوابی رد عمل۔ ہاں اب وہ پھپھی بھولی کو کرید سکتی ہیں، اپنی مرضی کی راہ پر ڈال سکتی ہیں۔۔۔۔ وہ دکھا سکتی ہیں جو خود دھندلے عکس کی طرح نظر آتا تھا اب وضاحت ہو گئی تھی۔

صفیہ ان دنوں بڑی خوش نظر آتی تھیں۔ جٹھانی سے بات چیت کے طویل دور بھی چلنے لگے تھے۔ سمیرا **معید** اور حمیرا کے ساتھ بیٹھ کر لڈو کی بازی بھی لگالی۔ ایک دو ڈرامے فیملی ڈرامے بن گئے۔ سارے اکٹھے بیٹھ کر دیکھتے۔۔۔۔ لیکن خوابوں کا محل مسمار ہو گیا۔

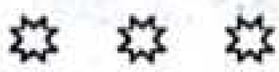
اے ڈی ریاض اور حمیرا کی دوستی نے گل کھلا دیا۔ صفیہ بھی آنکھوں سے دیکھتی تھیں پر یہ تو نہیں سوچا تھا۔۔۔۔ سب کچھ تو ویسے ہی ہو رہا تھا۔۔۔۔ جیسے کہ وہ سوچ رہی تھیں پھر اتنی بڑی چوک کیسے ہو گئی۔۔۔۔ یہ نہیں سوچا تھا۔۔۔۔ سوچا تو کچھ اور تھا۔۔۔۔ اور کمال ہے، پھپھی بھولی بھی تو وہیں موجود تھیں۔ عطیہ ذکیہ بھی۔

وہ تو بیٹی کو دھاگے، شیشے، تکیے کے کور دے کر بیٹھی تھیں۔۔۔۔ ہر بھرواں پھول۔۔۔۔ جیسے خوابوں میں رنگ بھرتا تھا۔

اور اتنی بھیانک تعبیر۔

"او خدا!" وہ سر پکڑے بیٹھی تھیں۔۔۔۔ کسی کو کیا الزام دیتی شاید غلطی خود ان ہی کی تھی۔ حمیرا جیسی پر بھروسا کر لیا۔۔۔۔ اپنی بیٹی کو کیا جانتی نہیں تھیں۔۔۔۔ پھپھی بھولی بے چاری کا بھی کیا قصور۔۔۔۔ انہیں ان کے پھول بوٹے پورے مل رہے تھے۔۔۔۔ باقی جائے بھاڑ میں۔۔۔۔ ہائے ایک بار دیکھ ہی لیتیں۔

پروفیسر اے ڈی ریاض۔۔۔۔ اور حمیرا امجید کرتے کیا تھے۔



حمیرا کی تیاریاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔۔۔۔ اس نے زندگی میں شاید پہلی بار خود پر اتنی توجہ دی۔۔۔۔ سر سے پیر تک (جوتی تک) تک سک سے درست وہ بیگ تیار کیے اے ڈی ریاض کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔۔۔۔ صفیہ دروازے پر کھڑی کی کھڑی رہ گئیں کسی نے اعتراض نہیں کیا جبکہ سب ہی صفیہ کے خیالات سے واقف تھے۔۔۔۔ کہ وہ حمیرا کے حوالے سے

کیا ارادے باندھے ہوئے ہیں۔"

"تم ماں ہو کر بیٹی کے مزاج سے واقف نہیں ہو سکیں چھوٹی بھابھی۔۔۔! عبدالعزیز اندر چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔۔۔ انہیں دھیمی چال سے اندر آتے دیکھا تو مخاطب کر لیا۔۔۔ صفیہ نے جیٹھ کو دیکھا پھر جٹھانی کو۔۔۔ معید بھی وہیں تھا اور ان سب کے خیالات ایک ہیں یہ ان کے چہروں سے عیاں تھا۔

"وہ شروع دن سے پڑھنے لکھنے کی شوقین رہی ہے۔ تم زبردستی اسے دھاگے کڑھائی میں الجھانے لگیں۔ اچھا ہے' اے ڈی نے اسے صحیح راہ پر ڈال دیا۔ بیٹی کا بھلا ہر ماں چاہتی ہے۔ کمال ہے' تمہیں اس کے دل کی خبر نہیں ہے۔"

صفیہ کے پاس بہت سارے جواب تھے۔ مگر وہی بات کہ وہ بولتی کم تھیں۔

دراصل معاملہ بہت واضح تھا۔۔۔ پڑھائی کے شوقین لائق فائق اے ڈی ریاض نے خود تو جو چاہا پڑھ لیا۔ (بلکہ وہ ہر وقت پڑھتا ہی دکھائی دیتا تھا) پھپھی بھولی کی اس معاملے میں ایک نہ چلی مگر جہاں اے ڈی نے بہنوں کی پڑھائی کی بات کی' وہاں یہی آہنی دیوار بن کر حائل ہو گئیں۔۔۔ دو بڑی میٹرک تک بڑی منتوں کے بعد پہنچیں۔ درمیان والی کا رجحان پڑھنے میں کم اور ماں کے ساتھ کام میں زیادہ لگتا تھا۔۔۔ لیکن سب سے چھوٹی والی کو شوق بھی تھا اور وہ قابل بھی تھی۔۔۔ ذرا سی توجہ سے اے ڈی کی اصلی بہن لگتی۔۔۔ مگر پھپھی نے اے ڈی کی تعلیم کو مان لیا تھا۔۔۔ یہی بہت بڑا احسان کیا تھا۔

چھوٹی کے بڑے رونے دھونے پر کالج بھیجا تو وہ بھی دو سال بعد انٹر کی شرط پر۔۔۔ چھوٹی نے نمایاں کامیابی حاصل کی اسے یقین تھا بھائی اس کے ساتھ ہے۔ مگر پھپھی پر کسی دلیل کا زور نہ چلا۔" بارہ جماعت بہت ہے ایسے ہی خرچا۔۔۔ ہاتھ میں ہنر ہونا چاہیے۔"

"پڑھائی بھی ہنر ہے اماں!" اے ڈی نے سر پیٹا۔

"ہاں ہے مگر اس میں بڑا ٹیم لگتا ہے اور پھر نوکری ملے نہ ملے۔ وہ خود کسی پروفیسر سے زیادہ کماتی ہے۔۔۔ بچیوں کو بے ہنر نہیں رہنے دی گی۔" لو جی قصہ ختم۔

اے ڈی خاموش ہو گیا۔۔۔ مگر تب ہی اسے حمیرا عبدالمجید مل گئی ذہین' قابل' پڑھنے کی شائق۔۔۔ کچھ بننے کی خواہاں۔۔۔ اسے بس کسی صحیح رہنما کی ضرورت تھی' وہ خام سونا تھی اور اے ڈی اس معاملے میں ایک جوہری ثابت ہوا۔ اس نے حمیرا کے خوابوں کی تعبیر کے لیے راستہ ہموار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔۔۔ صفیہ یہ سمجھ کر خوش ہوتی رہیں کہ حمیرا' پھپھی بھولی کے دل میں جگہ بنا رہی ہے۔۔۔ پھپھی کی مرضی کے سانچے میں ڈھل کر' جبکہ حمیرا تو اے ڈی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے من پسند راستے پر دوڑنے کی تیاری کر رہی تھی۔

عقدہ تو تب کھلا جب اس نے اپنے ہاتھوں کی تیار شدہ بیڈ شیٹس کورز' نمونے صفیہ کے ہاتھ میں رکھے۔

"لے ماں! جہیز کی پیٹی میں سنبھال کر رکھ دے۔۔۔ میں نے تیرا شوق پورا کر دیا اور اب میں جاتی ہوں پڑھنے۔۔۔ بہت سارا پڑھنے۔۔۔"

اور جانا کدھر یونیورسٹی۔ آنرز کے لیے۔۔۔ یونی ورسٹی کتنی دور۔۔۔ دوسرے شہر میں ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ۔۔۔ وہ پہلے آنرز کرے گی پھر ماسٹرز۔۔۔ وہ بھی ریاضی جیسے مشکل مضمون میں۔۔۔

صفیہ ہکا بکا رہ گئیں۔ عبدالعزیز نے سراہا اور کہا کہ وہ تمام اخراجات برداشت کریں گے۔۔۔ بڑی امی ہم خیال تھیں۔ سمیرا اے ڈی کی رائے سے اختلاف کر ہی نہیں سکتی (وہی محبت کا اصول۔۔۔)

رہا معید۔۔۔ وہ ہنستا رہا صفیہ کی حالت پر۔۔۔ اور یہ کہ اے ڈی ریاض نے بے چاری کو ریاضی میں الجھا دیا۔

صفیہ کے واویلا کرنے پر سب سمجھانے لگے۔ کیوں اتنی تنگ نظری کا ثبوت دے رہی ہیں۔۔۔ اے ڈی ریاض خود سمجھانے پہنچا۔

"میں ذمہ داری لے رہا ہوں ناں مامی۔۔۔ آپ کی لڑکی کو کسی قابل بنا کر چھوڑوں گا۔" اے ڈی پر یقین تھا۔

صفیہ چونکیں۔۔۔ ہاں وہ یہی تو چاہتی تھیں کہ حمیرا

اے ڈی کی نظروں میں رہے۔۔۔ تو یہ تو زیادہ آسان تھا۔

پہلے ان کا گمان تھا کہ حمیرا کو پھپھی بھولی کے دل میں (جگہ بنانی چاہیے اس نے بنالی سارے ٹانکے سیکھ لیے) بھلے سے وہ بھانپ چکی تھیں کہ اصل کردار و اختیار بھولی ہے حرف آخر۔۔۔۔ لیکن یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ حمیرا اے ڈی کے بھی نزدیک ہو جائے تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جائے اور اے ڈی کتنی تعریف کر رہا تھا حمیرا کی۔۔۔ وہ لاپرواہ فطرت رکھتی ہے۔۔۔۔ مگر بلا کی ذہانت کے ساتھ۔۔۔ شوخ و شنگ ہے مگر حساسیت کے ساتھ۔۔۔ اور اے ڈی اسے ایک کامیاب انسان بنتا دیکھ رہا ہے۔

اور مشکل کس چیز کی؟ اے ڈی ہے نا اس کے ساتھ، وہ ہر پل ہر مقام پر اس کا ساتھ دے گا۔ صفیہ کی آنکھیں چمکیں۔۔۔ ہر پل۔۔۔ ہر مقام۔۔۔۔ صفیہ نے مقام کی حد بھی طے کرلی۔

یہ نہیں دیکھا۔۔۔ وہ جملے حمیرا کے لیے کہہ رہا تھا۔ نگاہیں سمیرا پر جمی تھیں۔۔۔ وہ ماں کو ساری رات اور اگلے پورے دن بھی سمجھانے کے لیے بیٹھ سکتا تھا (بشرطیکہ سمیرا اسی طرح چینی گھول گھول کر چائے پیش کرتی رہے)

حمیرا کو یہ سارے ڈرامے سمجھ میں آرہے تھے مگر وہ کھسیانی بنی ہر دلیل پر سر ہلاتی تھی۔۔۔ بس اس کی ماں کسی طرح قائل ہو جائے۔

(بعد میں سمیرا اور اے ڈی دونوں کو جتا بھی دیا کہ اسے سب نظر آتا ہے اور۔۔۔ یہ بھی)

سمیرا نے انکار کرتے ہوئے تکیہ اٹھا کر مارا جبکہ اے ڈی نے کھنکھار کر تادیب کی "بری بات۔۔۔ بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

حمیرا ہنستی رہی۔ "بچے جو دیکھتے ہیں وہی باتیں کرتے ہیں۔ تنبیہہ کی ضرورت بڑوں کو ہے۔"

اے ڈی ہنس دیا۔۔۔ اسے اپنی معصوم سی کزن پیاری لگی تھی۔۔۔ اپنی بے حد مصروف زندگی میں اس نے کبھی نہیں جانا تھا کہ وہ دراصل ہے کیسی۔۔۔ اور جب اندازہ لگالیا تو سوچا کہ ایسی ذہانت و شوق کو ضائع ہونے دینا ظلم ہے۔۔۔ سو وہ ٹھونک بجا کر آگے آگیا۔۔۔ صفیہ کو قائل کرنا کوئی آسان تھا؟ اور صفیہ۔۔۔ وہ بالآخر مان گئیں۔

یوں اچانک مان گئیں۔ تو۔۔۔ شاید انہیں عقل آگئی تھی۔ سب نے سوچا۔۔۔ مگر صفیہ نے کچھ اور سوچا تھا۔

ان کی سوچ اور پلاننگ کی انتہا ایک ہی تھی۔

ایسے نہ سہی ویسے سہی۔

دراصل صفیہ۔۔۔



ہماری محبت کی شادی ہے۔ میرے گھر والے تو راضی نہیں تھے مگر جیت محبت کی ہوئی (وہی نا کہ والدین نے اپنی عزت رکھنے کے لیے نکاح کروا دیا۔ اور ساتھ ہی زندگی بھر کی لاتعلق کا اعلان بھی۔۔۔)

صفیہ ہر ایک کو فخر سے یہ بات جتاتی تھی۔ اس کے گردوپیش کی ہم عمر عورتیں کھسیاسی جاتیں۔۔۔ ان سب نے تو بس والدین کے کہے پر سر جھکایا تھا۔۔۔ شادی کی تھی۔ پھر محبت بھی ہو گئی ہوگی۔ عبدالمجید خوش شکل آدمی تھا۔ صفیہ قبول صورت۔

سب اسے رشک آمیز حسد سے دیکھتیں۔۔۔ عبدالمجید واقعی عاشق جانثار تھا۔۔۔ چھوٹی سی جنت تھی صفیہ کی دنیا۔۔۔ پھر اللہ نے پیاری بیٹی حمیرا دے دی۔۔۔ محبت کی نشانی۔۔۔ بڑی خوب صورت زندگی لیکن۔۔۔۔ صفیہ نے محسوس کرنا شروع کیا۔۔۔ وہ محلے والیاں جو اس سے اس کی لو میرج کے قصے سنا کرتیں چٹخارے لے کر۔۔۔ کہ کیسے دونوں کی ملاقات ہوئی۔۔۔ پھر ملاقاتیں۔۔۔ باتیں اور۔۔۔ محبت وہ کہاں کہاں ملتے تھے چوری چوری اور کیسے؟ پھر مخالفت پر اس کا احتجاج، کوشش اور جیت۔۔۔

صفیہ سچ میں اتنی رنگ آمیزی کردیتی تھی کہ لگتا کسی رومانٹک فلم کا اسکرپٹ سنا رہی ہے۔ ایک سے بڑھ ایک سچویشن۔۔۔ سننے والیاں آنکھیں مٹکاتی اور لطف اٹھاتیں پھر رات گئے جب تھکے ہارے شوہر

آتے تو انہیں سارا قصہ مزید نمک مرچ سے سنا کر طعنہ دیتیں۔ "بھائی مجید اب تک صفیہ کے لیے گجرے لاتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے منہ میں نوالے دیتا ہے۔" بعض مرد دلچسپی سے سنے جاتے۔ مگر بعض الرٹ بھی ہوئے۔

ایسی رنگین قصے سنانے والی عورت کی سنگت صحیح نہیں۔۔۔ بس سلام دعا رکھو۔ اسی طرح کچھ بڑی بوڑھیوں کے بھی کان کھڑے ہوگئے۔۔۔ بیٹیوں کو تو چھوڑو انہیں بہوؤں کے بگڑنے کا بھی خدشہ لاحق ہوگیا۔۔۔ دوسری طرف کچھ حاسد عورتیں۔۔۔ صفیہ کی لو میرج کا ٹھٹھا اڑانے لگیں۔ یہ نئی عجیب اور ناقابل قبول صورت حال تھی۔

لو میرج ایک ایسا کارنامہ تھی جو اسے دوسری عورتوں سے ممتاز کرتا تھا۔ مگر یہ کیا؟ اس نے اپنے کانوں سے سنا۔ نوعمر لڑکیوں کو اس سے قصداً "ایک فاصلے پر رہنے کی تاکید کی جارہی تھی اور۔۔۔ یہ کیا ہوا اس نے خود ہی بیٹھ کر اپنی غلطیوں کو سوچا۔ اور شعوری کوشش سے لو میرج والی بات کو چھپانے لگی۔

کل کو اس کی بیٹی کے کانوں میں بھی یہ قصے پڑیں گے تو وہ کیا سوچے گی۔۔۔ اور اگر اس نے بھی ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ا۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ کپکپا کر رہ گئی۔ لیکن سوچ کی سوئی اٹک گئی تھی۔۔۔ اسے ذمہ دار ماں کا کردار نبھانا ہوگا۔۔۔ اور کتنی بڑی بے وقوفی کردی۔۔۔ محبت مل گئی تھی یہ کافی تھا۔۔۔ اس کا اتنا پرچار کہ اشتہار بن کر پہچان بن جائے۔۔۔ غلطی ہوگئی تھی۔۔۔ اندازہ ہی نہ ہوا کہ جس چیز کو وہ فخر سے تمغے کی طرح سینے سے لگائے ہوئے ہے۔۔۔ وہ کل کو داغ محسوس ہونے لگے گی۔

اور پھر عبدالمجید فوت ہوگیا۔۔۔ اپنے سلجھے ہوئے مالک مکان میاں بیوی کی وجہ سے وہ بہت سی مشکلات سے بچی رہی۔۔۔ ورنہ لوگوں نے کیا کیا باتیں نہ کیں۔ کیسے کیسے قیاس۔۔۔ وہ الگ کہانی تھی۔۔۔ اور اس سے پہلے کہ انجام بگڑتا اسے عبدالعزیز اپنے ہمراہ لے آئے۔۔۔ عزت محبت' مرتبے کے ساتھ۔۔۔ مگر اس کا کیا کرتی' خراب قسمت۔

یہاں اس کا واحد تعارف یہی تھا۔ "یہ صفیہ ہے جس نے عبدالمجید سے پسند کی شادی کی۔۔۔ ماں باپ تو راضی تھے نہیں بس اپنی عزت بچانے کے لیے۔"

اوہ خدا۔۔۔ وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔۔۔ محبت داغ بن گئی تھی۔۔۔ اور کسی ڈٹرجنٹ میں وہ طاقت کہاں کہ۔۔۔

دوسری طرف۔۔۔ جٹھانی کی عزت مقام۔۔۔ اختیار و مرتبہ۔۔۔ وہ ایسے چبھتا تھا جیسے ایڑی کا کانٹا۔۔۔ زبان کا چھالا۔۔۔ آنکھ کا تنکا اور شکل۔۔۔؟

وہ رات ساڑھے گیارہ بجے عبدالعزیز کے ہمراہ یہاں پہنچی تھی۔ دروازہ جٹھانی نے کھولا علاقے میں لائٹ نہیں تھی۔۔۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ۔۔۔ وہ کھانے کا پوچھ کر اور بستر بچھے ہوئے کا بتا کر چلی گئی۔۔۔ صفیہ کی آنکھوں سے اس رات نیند دور رہی۔۔۔ مگر یہ رت جگا' طمانیت انگیز تھا۔۔۔ وہ خود دل کے اس سکون پر حیران تھی۔ صبح مدھم گفتگو پر اس کے کان کھڑے ہوئے۔

"عبدالمجید تو اپنا حصہ آپ سے لے چکا تھا اور پھر آپ کہتے ہیں اس گھر میں اس کا حصہ ہے۔۔۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ کیا میں بھول گئی کہ آپ آبائی مکان بیچنا نہیں چاہتے تھے اور وہ بضد تھا۔۔۔ تب میں نے اپنا زیور بیچ کر اسے حصے کی رقم دی بلکہ ہم مقروض بھی ہوگئے تھے اور آج آپ انہیں یہ کہہ کر لائے ہیں کہ۔۔۔ اس گھر پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے۔ وہ اپنا حصہ لے چکا ہے سمیرا کے ابو۔۔۔"

صفیہ نے ذرا آڑ میں ہو کر جھانکا۔۔۔ جٹھانی کا چہرہ سامنے تھا۔ ان کے لہجے کی تلخی اور باز پرس کا انداز بے حد چبھتا ہوا تھا۔۔۔ مگر صفیہ تو اس حسن باکمال کو تکے جارہی تھی جو جٹھانی کے نام پر پورے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔

عبدالعزیز بہت مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بیوی کو جواب دے رہے تھے۔

صفیہ جواب کو نظر انداز کیے ساکت تھی۔۔۔ اتنی حسین عورت۔۔۔ اس نے اپنے دل میں حسد کی کونپل

کو پھوٹتے دیکھا۔۔۔ اور اتنے سالوں میں اس نے کسی باغبان کی طرح اس کی آبیاری کر کے اسے تناور درخت بنادیا عبدالعزیز کے گھر آکر وہ مالی اور ذہنی طور پر پُرسکون ہوگئی تھی۔

میاں بیوی کی باہم گفتگو سے قطع نظر اتنے سالوں میں کبھی ان ماں بیٹی کو احساس تک نہ ہونے دیا کہ ان کی آمد پر جٹھانی کی طرف سے کچھ سوالات اٹھے تھے۔۔۔ اور عبدالعزیز نے سمجھانے بجھانے کے بجائے۔۔۔ دو جملوں میں سارا معاملہ سلجھادیا۔۔۔ سوال ختم کردیے تھے جواب دے دیے تھے۔۔۔ جواز ڈھونڈ لیے تھے۔

صفیہ مختلف محاذوں پر اپنے اندر چھڑی جنگ سے نبرد آزما رہیں۔

جیٹھ جٹھانی میں محبت ولگاوٹ کے مظاہرے نہیں تھے۔۔۔ مگر احترام محبت ومان کی جھلک دکھاتا ضرور تھا۔

وہ خود کو اس گھر میں دوسرے درجے کا شہری سمجھتی تھیں (یہ سراسر ان کی اپنی سوچ تھی) اور بیٹی بھی سمیرا اور معید سے کم تر دکھائی دیتی۔۔۔ صفیہ کو ہر وقت یہ خوف لاحق رہتا کہیں خاندان میں سے کوئی حمیرا کے سامنے لو میرج کا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔۔۔ محبت جرم لگنے لگی تھی۔ حمیرا ماں باپ کے بارے میں کیا سوچے گی۔۔۔ اگر وہ بھی محبت کا پٹا گلے میں ڈال کر گھسٹنے لگی تو وہ کیسے اسے باز رکھ پائیں گی۔۔۔ اور یہ بھی تو ضروری نہیں کہ وہ درست انتخاب کرے۔۔۔ اور پھر لوگ کہیں گے جیسی ماں ویسی بیٹی۔۔۔ تو بس ٹھیک ہے وہ اسے جلد از جلد بیاہ دیں گی۔

اس سے پہلے کہ وہ دنیا کو اپنی آنکھ سے دیکھے۔۔۔ وہ اسے رہٹ کے بیل کی طرح نظر باندھ کر جکڑ دیں گی کہ لو بچی! یہ ہے تمہارا دائرہ تمہاری دنیا۔

محبت' ایثار' خلوص کا مظاہرہ صرف عبدالعزیز کی طرف سے نہیں تھا۔۔۔ ان کے دونوں بچوں نے بھی ان دونوں کو اپنی زندگی میں یوں شامل کیا تھا۔۔۔ جیسے وہ ہمیشہ سے ان کا حصہ ہوں۔۔۔ عبدالعزیز نے خوف خدا کے تحت یتیم بھتیجی اور بیوہ بھاوج کو گھر میں جگہ نہیں دی تھی۔۔۔ دل میں بھی بسالیا تھا۔۔۔ وہ سب کے کانوں میں یہ بات ڈال چکے تھے۔۔۔ کہ حمیرا مجید کل کو حمیرا معید ہوگی۔۔۔ اور اس اعلان پر صفیہ پہلی بار چونکی تھیں۔

جیٹھ کا بیٹا ۔۔۔ معید۔۔۔ ہاں ایسے تو وہ ساری فکروں سے نجات پاجائیں گی۔۔۔ صفیہ نے جٹھانی کا چہرہ ٹٹولا' وہ مسکرا رہی تھیں۔۔۔ گویا تائید کررہی تھیں۔۔۔ کیا واقعی یہاں صرف خلوص تھا۔۔۔ عبدالعزیز خود اپنے اس آئیڈیے پر خوشی سے نہال نظر آتے تھے اور سمیرا بھی۔۔۔ وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

"اور سمیرا!" صفیہ فیصلہ نہیں کرپاتی تھیں۔۔۔ انہیں جٹھانی کا حسن زیادہ کاٹتا ہے یا جٹھانی کی بیٹی کا۔۔۔ وہ اپنا موازنہ جٹھانی سے کرتی تھیں اور حمیرا کا موازنہ سمیرا سے۔۔۔ دونوں کی عمروں میں فرق تھا۔۔۔ شکل و صورت و مزاج بھی ایک دوسرے کا الٹ۔۔۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ صفیہ ہمیشہ سمیرا کے مقابلے میں حمیرا کو دیکھتیں۔۔۔ پرکھتیں اور فیل کردیتیں۔

اور پھر جب اے ڈی سے اس کا رشتہ ہوگیا۔۔۔ تو حسد نئے سرے سے عود کر آیا۔۔۔ معید کسی طور کم نہیں تھا اے ڈی سے۔۔۔ وقت آگے بڑھتا تو وہ بھی قابلیت و کاملیت کے سارے درجے عبور کرلیتا۔۔۔ مگر بات تو وہیں آکر اٹکتی تھی ناں کہ دل کو شکر کی عادت نہیں تھی۔۔۔ اور نظر پر حسد کا غلبہ تھا۔

کڑھنا۔۔۔ جلنا۔۔۔ حسد۔۔۔ انسان کی طمانیت کو کھا جاتا ہے۔

حاسد ظالم ہوتا ہے۔۔۔ خود پر بھی ظلم ڈھاتا ہے۔۔۔ اور دوسروں پر بھی۔

حمیرا کو معید مل رہا ہے تو ٹھیک ہے۔۔۔ مگر سمیرا کو اے ڈی کیوں ملنا ہے کسی کو بھی مل جائے بس سمیرا کو نہ ملے اور پھر حالات نے پلٹا کھایا۔

وہ ٹہل ٹہل کر سوچتیں۔۔۔ دراصل حاسد پاگل ہوجاتا ہے۔۔۔ مگر افسوس ان کے لیے حکومت پاگل خانہ نہیں بنواتی۔ (یہ حکومت بھی ناں)

حسد کفران نعمت کی راہ پر ڈال دیتا ہے اور نعمتوں

سے منہ موڑنے پر بعض اوقات اللہ خفا بھی ہوجاتا ہے کہیں جب ہی تو......



یہ تو سچ ہے رات ہولاتی ہے...... خدشات کی ماں...... وہم کا باعث...... کالی شکل والی کالی رات، جو وحشت میں مبتلا کرتی تھی۔ اور یہ صبح...... چڑیوں کی چہچہاہٹ...... اجالے کی کرنیں...... پھولوں پتیوں پر ٹکے شبنم کے قطرے، ہوا میں بھی ایک سرمستی تھی...... خوشبو...... تو یہ صبح کی کرامات تھیں اور روشنی کی طاقت...... سارے خوف واوہام کہیں دور بھاگ گئے تھے۔

اتنے بڑے سفر کو اس نے ایک رات میں یاد کرلیا۔ اسے اپنا وجود ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ بشاشت لوٹ آئی تھی...... اسے ایک تازگی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک نیا پن، ایک ارادہ، ہمت، خیال اور فیصلہ......

چیزیں بگڑ جاتی ہیں...... مگر انہیں سدھارا بھی جاتا ہے۔ اصل بات ادراک کی ہے۔ احساس کی ہے۔ وہ کتنی ہی دیر کرسی پر بیٹھی اجالے کو پھیلتا دیکھتی رہی تھی۔ تایا ابو کے پورشن سے برتنوں کے کھنکھنانے کی آواز آرہی تھی۔ بھلا کون ہوگا سمیرا...... یا تایا ابو...... بڑی امی کی تو طبیعت ناساز تھی۔

اور یہ امی کہاں چلی گئیں...... وہ سارے گھر میں انہیں ڈھونڈنے لگی۔ باہری دروازے کا پٹ وا تھا...... اسے اچنبھا ہوا۔ ذرا سا سر نکال کر جھانکا...... تو رات کو ماں بیٹے واپس آگئے اور امی اتنی صبح ان کے گھر چلی گئیں۔ اسے ناگوار گزرا۔ اوہ، پھپھی بھولی کا دروازہ کھلا تھا۔ اور کیوں چلی گئیں۔ ہاں مجھے پتا کرنا چاہیے۔ اس نے لٹکتا پلو سر پر اٹکایا۔ آج آفس نہیں جاؤں گی۔ اس معاملے کو حل کروگی پہلے...... اس کا ہاتھ دروازہ پر تھا اور قیاس درست۔

صفیہ کی آواز آرہی تھی...... وہ بھی آہستہ آواز...... بے ضرر لہجہ...... (ضرر تو جملوں میں ہوتا ہے ناں......)

اسے ماں کے سارے خیالات یاد آئے۔ دل نئے سرے سے دکھا۔ تو یعنی امی باز نہیں آئیں۔ اور یہ پھپھی اتنا بڑھ بڑھ کر کیا بولے...... جاتی ہیں۔ پھپھی بھولی کی پاٹ دار آواز سماعت سے ٹکرائی تو اس کے قدم رک گئے۔ یہ پھپھی بھولی کا نئے انداز سے بنا گھر تھا۔ داخلی دروازے سے اندر داخل ہوں تو گیلری سی تھی۔ پھر ایک دوسرے دروازے سے اندر جانے پر سارا گھر سامنے آتا تھا۔ وسیع آنگن، برآمدے کمرے...... پھپھی نے ساتھ کا پلاٹ بھی خرید کر گھر کو خوب بڑا کرلیا تھا۔ وہ گیلری میں کھڑی تھی۔ نیم وا دروازے کے آگے پردہ لگا تھا۔ ذرا پتا تو لگے چل کیا رہا ہے۔ اس نے کان لگائے۔

"میرے قابل بیٹے کے لیے کوئی رشتوں کی کمی ہے...... لوگ تو گھر آکر نام لیتے ہیں۔ مگر مجھے کیا پتا تھا...... بھابھی نے میرے اندر اتنے کیڑے نکالنے ہیں...... اسے میری عادتیں پسند نہیں...... میرا مزاج پسند نہیں...... ہاں بس میرا بیٹا پسند ہے۔ تو جاؤ جی میں بیٹا بھی نہیں دیتی۔ میں اپنے حساب کی عورت ہوں صفیہ...... ساری زندگی بریک (باریک) سوئی سے موتی ٹانکے گن گن کر، مجھے غلطیاں کرنے کی عادت نہیں۔

اور اس سمیرا میں شکل کے علاوہ ہے کیا؟ بیوہ ہوکر زندگی گزاری، ہنر تھا میرے ہاتھوں میں......" بھولی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دکھائے۔ "سمیرا کے پاس کیا ہے، تعلیم کے نام پر کوئی کام کی ڈگری نہیں۔

(اوہ تو اے ڈی کی ماں ہونے کا یہ فائدہ ہوا پھپھی کو ڈگریوں کا پتا لگ گیا کام والی، بے کار)

اچھا خاصا پڑھ رہی تھی تو پڑھتی رہتی۔ پر ناجی تلیم ادھ وچ کار چھڈ کے (ادھوری تعلیم چھوڑ کے) سکولے پڑھان لگ گئی۔ اور اسکول بھی کون سا...... معذوروں والا...... جو خیرات پر چلتا ہے، خیراتی اب تنخواہ کیا دیں گے کوئی پروا نہیں۔

بس روز صبح اٹھے منہ ہاتھ رگڑے۔ باپ کی کمائی سے لشکیلے کپڑے چڑھائے اور پہنچ گئی نوکری کرنے اور نوکری کیا گونگے بہروں کو پڑھانا ہے۔

ایک میرا اپنا پتر...... بس سوال ہی یاد کرنے جوگی ذہانت تھی اس کی ذرا جو دنیا ورتانے کی مت ہوتی۔

(دنیا نبھانے کی عقل) بھئی جب تو اتنا قابل تھا تو کوئی ڈاکٹر انجینئر والی پڑھائی پڑھتا لے کر ماسٹر بن گیا۔ آگے نوں (بہو) بھی میں استانی لے آوں۔ کیوں جی، مجھے کوئی کتے نے وڈیا ہے۔ تلیم تلیم کا سیاپا ڈال دیا۔ تعلیم کے بھی طریقے ہوتے ہیں اگر جو مجھے اللہ دتا کی پڑھائی کے زمانے میں خبر ہوتی کہ پڑھتا کیا ہے وہ تو سیدھا سیدھا اچھی والی پڑھائی کروائی۔۔۔ کبھی ماسٹر نہ بننے دیتی۔ بے وقوف نکلا میرا پتر۔" پھپھی نے باقاعدہ ہاتھ ملے۔

"وہ بہت بڑی یونیورسٹی کا پروفیسر ہے بھولی آپا!" صفیہ کا لہجہ دھیما تھا۔

"ہاں۔۔۔ وہی ماسٹر صاحب۔۔۔!" پھپھی کے لہجے میں اپنے بیٹے کے لیے اتنا استہزا تھا تو وہ کسی اور کو کیسے بخشتی۔

"دیکھ صفیہ۔۔۔!" پھپھی بھولی نے صفیہ کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑا۔ "تو بھی میری طرح بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی، مگر تجھے مل گیا عبدالعزیز کا سہارا۔۔۔ مجھے کون ملا؟ بیچ جی چھوڑ کر مرا تھا تیرا بھائی، میں اگر ہنر والی نہ ہوتی تو بچے فاقوں سے مر جاتے۔ اس سمیرا کے ہاتھوں میں کیا ہے؟ تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ کوئی ڈاکٹر واکٹر بن جاتی چلو استانی ہی بن جاتی، مگر گورنمنٹ اسکول کی بنتی نا۔۔۔ مرنے تک پنشن بھی ملتی رہتی ہے۔ اس نے پڑھائی چھوڑی رستے میں۔۔۔ اور خیراتی اسکول میں اللہ کے نام پر گونگے بہروں کو پڑھانے لگی۔ کل کو کوئی مصیبت پڑے تو میں کیا سارے شہر کے ہتھ پیر ٹوٹ جانے کی دعائیں مانگنے لگوں کہ جی میرا اسکول چلے۔ بول بتا ذرا۔۔۔ ہنر ایسا ہو جو کام آئے۔"

پھپھی بھولی کی بات میں اس کا تجربہ بول رہا تھا۔ جو اس پر بیتی، جیسے اس نے زندگی گزاری، مگر بات کے اختتام پر وہ جو فلسفہ بیان کر رہی تھی جو خدشات وہ اس کی اپنی سوچ کا مظہر تھے۔ وہ جیسے دنیا کو دیکھتی تھی سمجھتی تھی۔

حمیرا کا دل دکھا۔ یا پھر یہ کہ حالات کی تلخیاں اور مشکلیں سہ سہ کر بھولی حقیقت پسند ہو گئی تھی، لیکن حقیقت پسندی کا یہ مطلب تو نہیں۔ بندہ اپنے ہاتھوں سے اپنا کلیجہ نوچنے کی بات کرے۔ اپنے اکلوتے بیٹے کے مرجانے کا گمان پال لے اور اس کی اولاد کی روٹی کی فکر مندی میں ہونے والی بہو کو بے ہنر قرار دے کر مسترد کر دے۔ کمال تھی پھپھی اور کمال تھا اس کا نظریہ۔۔۔

"اور یہ بات جانے بھی دوں۔ چلو اللہ سبب بنا دیتا ہے، مگر میرے کس کام کی ایسی نزاکتوں والی کڑی۔۔۔ جب رشتہ مانگا تھا تو سولڑکیوں جیسی ایک لڑکی تھی۔ پڑھنے لکھنے والی، قابل۔۔۔ مگر یہ تو بعد میں کھلا کہ ماں نے کوئی سلیقہ طریقہ سمجھایا ہی نہیں۔ سارا وقت بس منہ ہاتھ رگڑتی رہی۔ استری کر کے سوہنے کپڑے چڑھانے منہ کی کریم الگ، ہاتھوں کی الگ۔۔۔ پیروں کی الگ گز گز کا تو اس نے ناخن رکھا ہوا ہے اور اس پر سارا وقت رنگ لگا لیا۔ پتا نہیں نماز بھی پڑھتی ہے کہ نہیں۔ جتنی دیر میں اس نے پیپرن (ایپرن) لگانا ہے میں نے ادھے ٹبر کی روٹیاں بنا بھی لینی ہیں۔"

پھپھی کی آواز اور لہجہ تیز ہو گیا تھا۔ صفیہ کی ہنسی باہر تک آئی اور حمیرا کا دل چھلنی کر گئی۔ یہاں صفیہ کے مکالمے تو کچھ اور ہونے چاہیے تھے نا۔ دگرنہ "کہ نہیں بھولی آپا۔ ناخن رکھنا اس کا شوق ہے، نیل پالش خریدنے سے پہلے وہ ریمور خریدتی ہے صبح آٹھ بجے سے دو بجے تک کا شوق۔۔۔ دوپہر کی نماز تو اس نے کبھی قضا کی ہی نہیں۔"

مگر صفیہ کے مکالمے کیسے درست ہوتے، جب انہوں نے اپنا کردار ہی بدل لیا تھا۔ ایک نیا کردار۔۔۔ مار آستین کا کردار۔۔۔

وہ پھپھی کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں، واقعی سمیرا کے عیب بے شمار۔۔۔ بھول گئیں ساری زندگی حمیرا کو سمیرا کی مثال دے دے کر فقط منہ دھونے پر راضی کرنے کے لیے وہ سر پیٹ لیتی تھیں، کل کی مثال۔۔۔ آج کا عیب۔ واہ امی۔۔۔ آپ کتنے مزے سے، حساب سے چل رہی تھیں۔

"اور تو بھی یاد رکھ صفیہ۔۔۔ اللہ دتا کے لیے اب

میں جس لڑکی پر ہاتھ رکھوں، وہ گھر چھوڑ کر جائیں، مگر میری محنتوں کی کمائی پر..." پھپھی نے گردن اٹھا کر اپنے گھر کو فخر سے دیکھا۔ "کسی غیر کی لڑکی کیوں عیش کرے، عبدالعزیز بھی میرا بھائی... عبدالمجید بھی... اور میری عادت ہے صاف بات کرنے کی... مجھے حمیرا جیسی نوں ہی چاہیے جو میری طرح روٹی پر اچار رکھ کے کھالے۔ میری طرح بغیر استری کے کپڑے پہن لے اور سب سے ضروری بات... ہاتھ میں ہنر ہو۔ کتنی تنخواہ ہے اس کی؟"

ایک کے بعد ایک خوبی بتاتے ہوئے پھپھی نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

"ترنچاس ہزار پانچ سو۔" صفیہ کے لہجے میں غرور کا عنصر غالب آگیا۔

"ہاں..." پھپھی نے اپنے گھٹنے پر زوردار ہاتھ مارا۔ "یہ ہوئی نا بات... کل کو وقت پڑے تو کسی کا منہ تو نہ دیکھنا پڑے گا۔"

"اللہ نہ کرے آپا... خدا دونوں کو زندگی دے صحت دے۔" صفیہ کا جملہ بے ساختہ تھا۔ کیا اس لیے کہ بات اپنی بیٹی کی تھی اور یہ دونوں کون... حمیرا نے سوچا ایک تو حمیرا... تو دوسرا کون... اوہ اے ڈی ریاض...

"واہ ماں، ایک کو دو میں بھی گن لیا۔ دونوں ل ل ل..." اس کے ہاتھ دروازے پر سخت ہوئے۔

"اے ڈی مان جائے گا؟" صفیہ کی ساری گوٹیں نکل گئی تھیں۔ بس وہ ایک گوٹین پھنسی تھی گوٹین حمیرا مجید...

"کیسے نہیں مانے گا۔" پھپھی نے حسب عادت ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر دعوا کیا۔ "میرا بیٹا ہے وہ... جب اسے پتا لگے گا نا کہ کیسے ناہید نے مجھے ساری زندگی مذاق سمجھا، میرے خیالوں کا مذاق اڑایا۔ تو خود ہی پیچھے ہٹے گا، میں تو شکر کرتی ہوں صفیہ... جو تو نے مجھے ناہید کے سارے خیال بتادیے۔ میں اس کی خاموشی کو بیٹی کی ماں کی جھجک سمجھتی رہی اور وہ مجھ میں عیب نکالتی رہی۔" پھپھی کے لہجے میں گہرا افسوس تھا۔

غیبت... اور چغل خوری، حمیرا کو یہی دونوں عنوان موزوں لگے تو صفیہ نے یہ کام بھی کیا تھا اور اگر یہ سب بڑی امی سن لیں تو... کتنا دل دکھے گا ان کا... اے ڈی اور سمیرا کے رشتے والی بات سے بھی زیادہ... صفیہ نے بھروسے کا خون کیا تھا۔

"سچی بات تو یہ صفیہ... مجھے خود بھی پتا نہیں تھا۔ اللہ دتا اتنا لیق فیق (لائق فائق) منڈا ہے۔ ماسٹر صاحب کے کہنے پر پڑھنے ڈال دیا تھا۔" پھپھی بھولی صفیہ کے نزدیک ہو کر جیسے راز کی بات بتانے لگی۔ "پھر جب ادھر شہر آئی تو کون مجھے جانتا تھا۔ کوئی نہیں۔ بس ایک عبدالعزیز کا آسرا تھا۔ کل کو مجھے منڈا بیاہنا بھی تھا کہ نہیں... میں نے سوچا کہ جب وہ پڑھ لکھ جائے گا تو کڑی بھی پڑھی لکھی مانگے گا تو میں کہاں ڈھونڈنے جاؤں گی، چلو اس سمیرا کا نام ہی پکا کر دوں۔ مجھے کیا پتا تھا میرے پتر نے اتنا قابل نکلنا ہے کہ بڑے بڑے لوگ اپنے منہ سے رشتہ ڈالیں گے۔ اللہ دتا کے کالج کے سب سے وڈے افسر نے اپنی بہن کے لیے خود مجھے کہا۔ ساتھ پڑھانے والی دو استانیاں بھی اسے تحفے شحفے دیتی ہیں۔ سارا شہر مجھے اے ڈی کی ماں کے نام سے جانتا ہے۔ مجھے کوئی تھوڑ (کمی) ہے کڑیوں کی۔"

صفیہ سر ہلا رہی تھیں۔ حمیرا ہونق ہوگئی پھپھی بھولی کیا واقعی بھولی تھیں کہ بنا سوچے سمجھے کچھ بھی بول دیتی تھیں۔ انہیں اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس طرح کی باتیں کر کے وہ خود کو کتنا مطلب پرست، خود غرض، مفاد پرست اور... اور نجانے کیا کیا بنا کر پیش کر رہی تھیں اور صفیہ کو ان کی ہاں میں ہاں ملانی چاہیے تھی یا آئینہ دکھانا چاہیے تھا۔ (مگر آئینہ کیسے دکھائیں جب دونوں ہی ایک دوسرے کی پرچھائی ہو گئیں تو...)

اس کے صبر کی حد ختم ہو گئی۔ وہ ابھی اندر جا کر دونوں کا دماغ درست کرے گی اور یہ بھائی اللہ دتا ریاض کدھر تھا صبح سویرے... اگر وہ بھی ماں کا ہم

خیال ہوا.... تو ہوا کرے وہ اسے بھی ٹھیک کرنا جانتی ہے بلکہ ٹھیک ٹھاک.... اس نے ایک زور دار آواز سے دروازہ کھولا تھا وہ.... پردے کے پیچھے یعنی درمیان میں بڑی امی کھڑی تھیں تو جو کچھ وہ سن رہی تھی.... وہ .... وہ بھی سن رہی تھیں۔ بھیگا چہرہ.... نجانے کب سے۔

اتنی ہی دکھی.... بلکہ زیادہ....

اتنی ہی غضب ناک.... مگر شکستہ.... وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں اور کیا کیا نہیں تھا بڑی امی کی آنکھوں میں سب کچھ.... بہت کچھ....

دروازے کی آواز پر صفیہ اور بھولی بھی چونکی تھیں۔

"او کون ہے' دروازہ پٹ مارنا ہے۔ (توڑ دینا) پورے باون ہزار کا دروازہ ہے۔ لکڑی تول کے (یعنی وزن مستند ہے۔)" بڑی امی کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پل بھر کو نمودار ہوئی یہی **سطحیت** تو ناپسند تھی بھولی کی.... صاف گوئی کو لوگ خوبی کہتے ہیں۔ ہوگی خوبی.... جیسے میٹھا اچھا لگتا ہے' مگر حد سے بڑھ جائے تو بیماری۔

"او کون ہے دروازے پر؟" پھپھی شاید اس طرف آرہی تھی۔ بڑی امی نے باہر کی طرف قدم اٹھائے۔ اب کیا بچا تھا وہ کس لیے رکتیں' آئی تو تھیں کہ بھولی سے پوچھیں گی کیوں کس لیے.... اب پتا لگ گیا تھا.... یوں.... اور اس لیے.... مگر راستے میں حائل تھی حمیرا عبدالمجید.... اس نے ان کا ہاتھ دبوچا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتیں' اس نے دوسرے ہاتھ سے چوڑے پردے کو سرکا دیا ـــــ منظر واضح ہوگیا۔

دروازے کی جانب آتی پھپھی ٹھٹک کر رکی تھی۔ صفیہ کی منتظر نگاہوں کو بھی جھٹکا لگا اور حمیرا کا فیصلہ کن جارحانہ انداز.... مرجائے گی یا مار دے گی' مگر کس کو.... پھپھی بھولی نے چونک کر صفیہ کو دیکھا تھا۔



"کہاں سے کہانی شروع کروں اور کیا کیا بتاؤں....

اور کیوں بتاؤں امی' بتایا تو اسے جاتا ہے جو انجان ہو۔ آپ پر تو پھر بیتی تھی۔

حمیرا کی آواز دکھ اور صدمے سے بوجھل تھی۔

بڑی امی کو اس نے سامنے کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ وہ یوں اکڑی بیٹھی تھیں جیسے پھانسی والی الیکٹرک چیئر پر بٹھائی گئی ہوں۔ ناک کی سیدھ میں دیکھتی قصداً "انجان....

"آپ میری تنخواہ کے انچاس ہزار گنتی ہیں پھپھی....!" وہ کب سے بول رہی تھی۔ مخاطب کبھی ماں ہوتی' کبھی پھپھی....

"یہ معلوم ہے اس تنخواہ تک پہنچانے کے لیے تایا ابو نے کیسے پیٹ کاٹ کاٹ کر فیس بھریں اور پھپھی سے کیا گلہ امی.... آپ نے کبھی اپنی کسی ضرورت کے لیے منہ سے کہا؟ انہوں نے بند لفافہ آپ کے کہنے سے پہلے آپ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اسے صلہ رحمی تو کہہ سکتے ہیں۔ فرض نہیں.... جب کہ ابو پہلے ہی اپنا حصہ وصول کر چکے تھے۔ اور یہ بات بڑی امی نے جب ان سے کہی تو ان کا جواب کیا تھا؟"

صفیہ نے سر اٹھایا۔ وہ ان ہی سے پوچھ رہی تھی۔ صفیہ کی نگاہیں بڑی امی پر جم گئیں۔ یہی سوال تو برا لگا تھا۔ کیوں پوچھا تھا انہوں نے شوہر سے....؟ یعنی جٹھانی کو ان کی آمد ناگوار گزری تھی جب ہی تو سوال اٹھایا تھا اور یہ بات کل رات بھی صفیہ نے بیٹی کے سامنے دہرائی تھی جب وہ احسان گنوا رہی تھی' اتنے سال پہلے کی وہ رات.... اس سوال کی چبھن آج تک باقی تھی۔ جیٹھ کا جواب سنا ہی نہیں (حالانکہ ایک بیوی کی حیثیت سے اپنی کسی بھی الجھن کا سوال کا جواب طلب کرنے کا حق محفوظ رکھتی تھیں)

"آپ تایا ابو کا جواب بھول گئیں امی! مگر میں نہیں۔" اس کا لہجہ پگھلنے لگا۔

"اس گھر میں مجید کا کوئی حصہ نہیں سمیرا کے ابو!"

"ہاں....!" عبدالعزیز نے تسلیم کیا' "لیکن میرے دل میں تو اس کا حصہ ہے نا۔ وہ میں نے اسے کبھی نہیں دیا۔ وہ آج بھی وہیں رہتا ہے۔ گھر تو بہت بے کار سی چیز ہے' دولت جائیداد' زر زمین میں سے حصہ دیا جا سکتا

ہے دل کی تقسیم نہیں کی جاسکتی۔"
کمال ہے، حمیرا کو من و عن سب یاد تھا حالانکہ یہ تو بہت پرانی بات تھی۔ بہت چھوٹی بچی تھی وہ اس وقت تو اس نے اس اتنی خاص لاجواب کردینے والی بات کو یاد رکھا تھا اور اس کی اصل روح کو پہچانا تھا۔
"کمال ہے۔" صفیہ چونکی تھیں۔ ہاں عبدالعزیز بیوی کو کچھ جواب دے تو رہے تھے، مگر وہ "سوال" کی چبھن کے احساس میں ایسی کھوئیں کہ سنا ہی نہیں سمجھنا تو پھر دور کی بات ہے۔
"اور پھپھی آپ...! آپ صرف نام کی بھولی نکلیں۔ ورنہ آپ کے حساب کتاب اور جوڑ توڑ سے تو صاف پتا چلتا آپ کا بھولپن سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا۔"
"کیسے طریقے سے آپ نے وقت گزارا۔ جس لڑکی کے مکھن ورگے ہتھ پیروں کو سراہتی تھیں ان میں آج کیا کیڑے پڑگئے؟ کیسا درست استعمال کیا آپ نے انسانوں کا...
میں تو آپ کو بہت سیدھا سادا، صاف گو، حقیقت پسند انسان سمجھتی تھی۔ بڑی قدر تھی آپ کی میرے دل میں... مگر ایسی حقیقت پسندی..." اس نے جھرجھری لی "وہ نہ کبھی دیکھی نہ سنی کہ آپ خود اپنے بیٹے کے خدانخواستہ مرجانے کا گمان کرتی ہیں۔ توکل نہ سہی مامتا ہی سہی... مرنا تو خیر ہر ایک نے ہے ہی... مگر ایسی انوکھی بات نہ دیکھی نہ سنی کہ جی بہو باہنر اس لیے لانی ہے کہ بیٹا مرجائے تو وہ گھر کو سنبھال لے... کس گمان میں جیتی ہیں آپ... ہر عورت بیوہ رہتی نہیں ہے کیونکہ ہر عورت بھولی یا صفیہ بھی نہیں ہوتی کہ ایک شخص کے نام کو حرف آخر سمجھ کر جیے... بیوہ راہ بدل بھی تو سکتی ہے، بچے چھوڑ کر بھی چلی جاتی ہیں۔ نیا گھر بسا لیتی ہیں پھپھی... آپ کس خدشے میں جی رہی ہیں؟"
وہ حقیقتاً" شدید حیرت کا شکار پھپھی سے جواب کی منتظر تھی اور پھپھی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ "ہاں یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں۔" حمیرا کی تقریر سنی تو پل بھر
میں وہ سب عورتیں بھی یاد آگئیں جو بیوگی کے چار چھ ماہ بعد بچے ادھر ادھر چھوڑ چھاڑ کر نئی دنیا بسا کر چلی گئیں، لیکن... اگر وہ اپنے حساب سے سوچتی تھی تو کوئی غلط تو نہیں تھا۔ اس نے کس مشکل سے بچوں کی روٹی پوری کی تھی۔ اگر بے ہنری ہوتی تو؟ اس نے سوئی سے ہی تھیں روٹیاں... جب ہی تو بیٹیوں کو طاق کرکے اگلے گھر بھیجا تھا۔ وہ اپنی سوچ میں بالکل درست تھی، لیکن یہ جو حمیرا نے دوسری بات کی طرف دھیان کروایا تو وہ...
پھپھی کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ وہ باز نہیں آسکتی تھی۔ اتنے مشکل تھے بیوگی کے سال کہ ہر چیز کا تاریک پہلو پہلے نظر آتا تھا۔
اس وقت بھی اسے یہ دکھائی دینے لگا۔ اللہ دتا مرگیا ہے اور بہو نئی دنیا بسا کر یہ جا وہ جا... اور... وہ اس کے پوتے پوتیاں رلتے پھرتے۔
"ہائے..." پھپھی بھولی کے دل پر ہاتھ پڑا۔ آنکھ سے آنسو بہہ نکلے۔ دل خراش منظر...
یہ حمیرا نے کیا کہہ دیا تھا۔ کیا دکھا دیا تھا۔
پھپھی کی نگاہیں حمیرا کی جانب اٹھیں، مگر وہ متوجہ نہیں تھی وہ صفیہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔
"آپ کو معید کے رشتے کے لیے منع کرنا تھا امی...! تو آپ بس یہ کہہ دیتیں کہ آپ کو کرنا نہیں ہے۔" اس کی آواز رندھ گئی۔ "آپ نے معید کے لیے اتنے برے الفاظ استعمال کیے امی۔" اسے اپنی تکلیف بیان کرنے کے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔
"آپ نے کہا کہ معید، وہ..."
"حمیرا..." بڑی امی نے تڑپ اٹھنے والے انداز میں اسے ٹوکا تھا۔ "وہ سب مت دہرانا۔"
"کیا... کیا سب...؟" وہ چونکی۔ صفیہ نے بھی سر اٹھایا تھا۔ وہ کس بات کو دہرانے سے منع کررہی تھیں۔ انہیں کیا پتا حمیرا کیا کہنے والی ہے۔
"میں نے رات تم ماں بیٹی کی ساری باتیں سن لی تھیں۔"
"اوہ..." صفیہ کے منہ سے سانس خارج ہوئی

بڑی امی نے وہ... سب... سن... لیا تھا۔ وہ سب جیسے یاد کرنے سے بھی اسے تکلیف ہوتی تھی۔

اب وہ کیا بولے... صفائی دے، مگر کیسے... جھٹلا دے، مگر جھٹلا دینے سے کوئی حقیقت بدلتی ہے۔

"اوہ!" اسے یک دم یاد آگیا جیسے جان واپس آگئی۔ ہاں اسے صفائی کی کیا ضرورت ہے۔

"اگر آپ نے رات ہم ماں بیٹی کی باتیں سن لی تھیں تو..." وہ قصداً" رکی۔ "تو پھر آپ نے میرے جواب بھی سن لیے ہوں گے۔"

بڑی امی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ہاں اس کے جواب یعنی اس کی رائے...

باتیں چھپ کر سنی تھیں سو سچائی پر انگلی نہیں اٹھا سکتی تھیں اگر ماں سچ بولی تھی تو بیٹی بھی... اور اس کی آنکھیں بھی اس وقت یہی جتا رہی تھیں کہ بڑی امی آپ نے میرا سچ بھی تو سن لیا تھا نا...

حمیرا کا دل مضبوط ہوگیا، مگر یہ کیا بڑی امی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور کیا کہہ رہی تھیں۔ ان کی مخاطب صفیہ تھیں۔

"تم فکر مند نہ ہو صفیہ... تمہیں انکار کی ضرورت نہیں اور نہ جواز کی... سمیرا کے ابو چھ سال پہلے ہی اس رشتے کو نہ کرنے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔"

"کون سا رشتہ...؟" حمیرا چونکی۔ سمیرا اور اے ڈی کا...

"معید اور حمیرا کا رشتہ..." بڑی امی نے الجھن رفع کی۔ ایک نظر تینوں پر ڈالی۔ پھپھی تو سوچوں کے نئے جہان میں غرق ہوچکی تھیں۔ انہیں جیسے کچھ سنائی ہی نہ دیتا تھا جبکہ یہ ماں بیٹی... صفیہ فقط حیران تھیں یہ کب ہوا۔ انہیں تو نہیں معلوم...

جبکہ حمیرا... اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہوچکا تھا۔

وہ بے یقینی سے بڑی امی کو دیکھ رہی تھی جو اپنی بات کہہ کر صحن عبور کررہی تھیں۔



کیسا صدمہ پہنچا تھا۔ بھولی آپا کے انکار سے یا انکار سے زیادہ اس بات کا کہ ان کی بیٹی کو چھوڑ کر حمیرا کا رشتہ طلب کرنے کا... یا پھر صفیہ کے اقرار کا یا دھوکے کا تو دراصل یہ دکھ کی پوری سیریل تھی۔ ایک کے بعد ایک جھٹکا... تین دن سے رو رہی تھیں۔ بازپرس کا دل چاہتا تھا، مگر کیا پوچھتیں اور کس سے؟ دن کا قرار لٹ گیا اور رات کی نیند...

حلق خشک ہوا تو پانی پینے باہر آئی تھیں پھر برآمدے میں نکل آئیں۔

ایک عالم محو خواب تھا، لیکن کوئی اور بھی جاگ رہا تھا۔ پر کون...؟ باتوں کی آوازیں تھیں۔ عبدالعزیز تو "اللہ مالک ہے" کہہ کر گہری نیند میں چلے گئے اور وہ رشک سے انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

سوئی ہوئی سمیرا پر خود بھی آیات پھونک کر باہر آئی تھیں۔ تو کیا معید... لیکن باتوں کی آواز تو ادھر صفیہ کے پورشن سے آرہی تھی۔ وہ کسی ارادے کے بنا آگے تک چلی آئیں۔

حمیرا کی آواز بلند تھی اور صفیہ کے حسب عادت دھیمی... مگر رات کی خاموشی میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

اور پھر یہ وہی باتیں تھیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے اس سے اچھا تھا۔ ہم بہرے ہوتے، مگر جو عذر صفیہ نے ڈھونڈے تھے۔ دل رات سے بھرا ہوا تھا ان باتوں کو سننے کے بعد تو گھر کی دہلیز پھلانگ گئیں اور پھر صبح صبح... وہ نجانے کیوں بھولی کے گھر کی طرف چلیں۔ پھر وہاں ان سے پہلے صفیہ موجود تھیں اور پھر حمیرا بھی آگئی اور پھر جو کچھ ہوا وہ کسی سے تو کہنا تھا۔ تو بہترین سامع بیٹی کے علاوہ اور کون ہوتا۔

اور سمیرا اس کی سوچی آنکھیں... وہ چھپ کر روتی تھی۔ صاف نظر آتا تھا، مگر اس وقت وہ فقط حیران تھی، بے یقین، ماں سے وہ سب کچھ سن رہی تھی جو رات ماں نے سنا تھا صفیہ اور حمیرا کی بھی باتیں...



"اتنے خاموش تو تم نہیں ہوتے؟" عبدالعزیز نجانے کب سے معید پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔
"میں... خاموش... ؟ نہیں تو..." اس نے صاف انکار کردیا۔
"میں تو اخبار پڑھ رہا تھا۔"
"اتنا اخبار بھی تم کبھی نہیں پڑھتے؟" وہ آخر اس کے باپ تھے۔
"ہاں بس وہ..." اس نے اخبار کا صفحہ پلٹا پڑا مگر نظر آرہا تھا نجانے کس خبر کا بقیہ پڑھنے کی عجلت تھی۔
"اور...؟" عبدالعزیز اس کے سر پر پہنچ گئے۔
"الٹا اخبار تو تم کبھی بھی نہیں پڑھتے تھے۔ یہ ہنر کب سے سیکھا۔" وہ پوچھ رہے تھے۔
"اوہ اچھا تو یہ الٹا تھا..." اس نے پروں پر پانی نہ پڑنے دیا۔ فوراً سیدھا کیا اور پڑھنے بھی لگا۔
"کیا چھپانا چاہ رہے ہو بیٹا...؟"
"کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں ابو...؟" اس نے اخبار لپیٹ دیا۔
"صفیہ کے انکار سے دکھ ہوا ہے؟"
"آپ کو ہوا ہے...؟" اس نے پہلے ان کا حال دل جاننا مناسب سمجھا۔
"نہیں..." وہ سچ کہہ رہے تھے۔
"تو پھر مجھے بھی نہیں ہوا۔" وہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔
"جو ابدہ... ختم ہوا۔ بڑا بن رہے تھے عبدالعزیز افتخار احمد"... ہونہہ!"
"ابھی جھوٹ بولنے میں اتنی مہارت بھی حاصل نہیں کی کہ اپنے باپ کو چلاؤ گے۔"
"اوہ...!" وہ پیارا سا مسکرایا۔ "میں بھی آپ کے بارے میں یہی کہنا چاہ رہا تھا۔"
"ہم یہاں مکالمہ بازی کرنے نہیں بیٹھے معید...!"
"تو پھر آپ ہار مان لیجیے۔"
"یعنی تم نہیں بتاؤ گے کہ تم دکھی ہو۔" سوال سے زیادہ دکھ ان کے لہجے میں تھا۔
"آپ نہیں ہیں۔" اس نے ہار مان لی۔ آنکھوں سے شکستگی جھلکنے لگی تھی۔
"ہوں... باوجود اس کے کہ میں تو چھ برس پہلے ہی اپنے خواب سے دستبردار ہو گیا تھا۔" عبدالعزیز نے بھی سچ کہا۔ اسی میں عافیت نظر آئی تھی۔
"تو پھر میرا بھی یہی جواب ہے ابو...! چچی جان کا حق ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا بھلا چاہیں اور صرف وہ ہی کیوں؟ کیا آپ نہیں چاہیں گے کہ اسے زندگی میں بہت خوشیاں ملیں۔ اسے غم کی ہوا نہ لگے اسے..." وہ بولتا چلا گیا۔ خواہش یعنی وہ دعائیں جو وہ اس کے لیے کرتا تھا۔
"اسے...؟ اس کا نام کیوں نہیں لیتے... حمیرا..." یاد دہانی کے لیے نام دہرایا۔ عبدالعزیز کو "اسے" کے تخاطب سے ظاہر ہوتی اجنبیت کھلی تھی۔ معید عبدالعزیز چونکا پھر مسکرا دیا۔
"تکلیف ہوتی ہے ابو... لگتا ہے کھو دیا۔ یہ اجنبیت برقرار رہے "استقامت کے لیے ضروری ہے۔" تو اس نے اپنا اندر کھول دیا تھا۔
"جب چھ برس پہلے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیا تھا تو اس وقت ایسی باتیں کیوں؟" عبدالعزیز کو اپنا بڑھاپا پہلی بار زیادہ محسوس ہوا یا اپنی بے بسی۔
"میں تو نہیں کر رہا۔ آپ اگلوانے کی قسم کھا کر آئے ہیں۔" اس نے باپ کو گھورا۔
وہ ان کے قد سے کچھ اونچا تھا۔ عمر میں بہت چھوٹا... مگر وہ اس پوری دنیا میں ایک دوسرے کے اچھے دوست تھے۔ سب سے پکے والے۔ ایسے دوست جو دل کی باتیں ایک دوسرے سے کر سکتے تھے بلکہ کہے بغیر بھی سمجھ سکتے تھے۔
دکھ صرف یہ ہے "تکلیف اس چیز کی ہے کہ چچی اتنا سب پلان نہ کرتیں۔ سمیرا کی جگہ حمیرا..."
"اسے یہی بہتر لگا ہو گا حمیرا کے لیے..."
"مگر یہ ہو نہیں سکتا..." معید کا قطعی پن نمایاں تھا۔
"کیا مطلب؟" عبدالعزیز چونکے۔
"جتنا میں اے ڈی بھائی کو جانتا ہوں وہ کبھی نہیں مانیں گے۔"
"اور حمیرا بھی نہیں مانے گی۔"

"کیا؟"
"اے ڈی سے شادی۔۔۔ کسی سے بھی کرے گی، مگر اس سے نہیں۔" عبدالعزیز کیا اتنا بھی نہ جانتے حمیرا کو۔۔۔
"دعوے مت کریں ابو! پھر دکھی ہوں گے۔"
"کیا مطلب؟"
"کیا خبر وہ بھی چچی کی ہم خیال ہو۔ وہ اب صرف آپ کی پیاری بھتیجی نہیں رہی، اتنی بڑی افسر ہے۔ چار سال سے اے ڈی بھائی کے ساتھ ہے بلکہ آج جو کچھ ہے اس میں اے ڈی بھائی کی محنت و دلچسپی کا ہاتھ ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا ذہن بھی بن گیا ہو جب ہی پھپھی بھولی نے اتنی بڑی بات کہی اور چچی نے جھٹ مان لی۔"
وہ اس پہلو پر بہت زیادہ سوچ چکا تھا۔ دونوں کا جوڑ بنتا تھا عمروں کا فرق ذرا زیادہ ہو تا مگر۔۔۔
"لیکن پھر۔۔۔ سمیرا کا کیا ہوگا؟" عبدالعزیز کی نظریں بے ساختہ بیٹے کی جانب اٹھیں اور پھر ہار گئیں۔ وہاں بھی یہی سوال تھا۔
"ہم آپی کے لیے کوئی اور رشتہ تلاش کرلیں گے۔ وہ اتنی پیاری، اتنی اچھی ہیں۔ کون منع کرے گا۔"
"وہ خود کردے گی۔" عبدالعزیز کی آواز کسی کنوئیں سے برآمد ہوئی۔
"تمہیں نہیں معلوم، اس نے بچپن سے اپنے نام کے ساتھ اے ڈی کا نام جڑا دیکھا ہے۔"
"انہیں اپنے دل کو سمجھانا ہوگا۔ حمیرا کی خوشی کے لیے۔۔۔" معید نے بہن کے لیے کہا۔
"حمیرا کی خوشی کے بچے۔۔۔"
یہ غضب ناک پکار حمیرا کی تھی۔

☆ ☆ ☆

"معید سے شادی۔۔۔!" صفیہ نے کتنی دقت سے یہ تین لفظ کہے تھے۔
"ہاں معید سے شادی۔۔۔" حمیرا نے کتنی آسانی سے ہاں کا اضافہ کردیا تھا۔
"تمہارا دماغ چل گیا ہے حمیرا۔۔۔ تم خود کو دیکھو اور اسے دیکھو۔"
"کہاں تم اور کہاں وہ۔۔۔" حیرت کی زیادتی سے صفیہ کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔ تم کہتے ہوئے اس نے چھت کو دیکھا تھا اور "وہ" بتاتے ہوئے زمین کو۔۔۔ حقارت سے۔
"امی۔۔۔ آپ مجھے یہ بتایئے آپ مجھے کہاں دیکھ رہی ہیں۔ آسمان پر؟ مگر یہ کیوں بھولتی ہیں۔ آسمان کو دونوں ہاتھوں پر بھی اٹھالیں تب بھی پیر زمین پر ہی ٹکانے پڑتے ہیں۔"
"مجھے سبق پڑھا رہی ہو۔ تم کیوں بھولیں، زمین پیروں کے نیچے ہوتی ہے۔" صفیہ نے اپنے تئیں اسے لاجواب کردیا تھا اور وہ ہوگئی تھی لاجواب۔ ششدر۔
"امی۔۔۔! آپ یہ معید کے لیے کہہ رہی ہیں۔"
"ہاں۔۔۔!" صفیہ نے دبنگ لہجہ اپنایا۔ "تمہارا اس کا جوڑ ہے کوئی۔۔۔ تمہارا معیار۔۔۔"
"ہاں امی! میرا معیار۔۔۔" اس نے ہاتھ اٹھایا۔ "ڈرائیور عبدالمجید کی یتیم بیٹی جسے گھر خالی کرنے کا نوٹس ملا تھا اور رات سر پر کھڑی تھی۔ میں بلبل تھی امی! جگنو کی آرزومند۔۔۔ مجھے آسمان مل گیا امی! آپ بھول گئیں۔ پوری کہکشاں جس نے میری زندگی کو روشن کردیا اتنا کہ مجھے کبھی رات بھی تاریک نہیں لگی اور آپ کہتی ہیں احسان نہیں کیا تھا۔ چچا، تایا یتیم بچوں کے سر پر ہاتھ ہیں۔ سر پر ہاتھ امی۔۔۔؟ ان سب نے مجھے دل میں جگہ دی تھی۔" اس کے لہجے میں کوٹ کوٹ کر درد بھرا تھا۔
"ہاں تو اس احسان کے بدلے میں اپنی بیٹی ان کے زمانے بھر کے نکمے بیٹے کو تھمادوں۔ اس میں ہے کیا۔۔۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔۔۔ چلتے پھرتے بجتا ہے جیسے جھنجھنا۔"
حمیرا کی سانس کہیں اندر ٹھہر گئی۔ امی نے کیا کہا تھا یا اس نے کیا سنا تھا۔
"جھنجھنا؟ یہ آپ نے معید کے لیے کہا امی۔۔۔؟"
"ہاں کون سی ہڈی سلامت ہے اس کی۔۔۔ کو لے

میں پلٹیں۔۔۔ ٹانگوں میں راڈ نشانوں تک پر نٹ گئے ہیں۔ میں نہیں دے سکتی احسان کی اتنی بڑی قیمت۔۔۔ اور احسان بھی کیسا اپنے بھائی ہی کی تو اولاد تھی غیر تو نہیں۔۔۔"

"جب تایا ابو نے رشتہ دیا' وہ ایسا نہیں تھا امی۔۔۔" اس نے یاد دلایا۔

"مگر اب وہ ایسا ہی ہے جیسا میں بتا رہی ہوں۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"آپ کو پتا ہے' آپ کتنی بری باتیں کر رہی ہیں۔"

"یہ مت بولو حمیرا۔۔۔ تم نے اسے کیا غور سے دیکھا نہیں۔ لگتا ہے ہینگر پر کپڑے ٹنگے ہیں۔"

"امی۔۔۔!"

"ہڈیوں پر منڈھی کھال۔۔۔ اس سے زیادہ جسم تو کھیت میں کھڑے کاں گڈے کا ہوتا ہے۔"

"امی جی۔۔۔!" اس کے احتجاج کی شدت نے گردن کی رگیں پھلادی تھیں۔

"ایک آنکھ سے وہ تجھے کیا دیکھے گا' کبھی سوچا۔" صفیہ ہر چوٹ پچھلی سے کاری لگا رہی تھیں۔

"امی۔۔۔!" وہ یک دم بے دم ہو گئی۔ (ہاں اس کی دونوں آنکھیں اپنی جگہ موجود تھیں۔ بولتی مسکراتی اور اب تو ان میں زندگی کے نئے رنگ خواب اور عزم بھی جھلکنے لگے تھے' مگر ایک کم دکھائی دیتا تھا' مگر یہ عیب نظر تو نہیں آتا تھا۔

ہاں وہ دبلا پتلا رہ گیا تھا' مگر نقش تو ویسے ہی دل میں اتر جانے والے تھے۔ ہاں وہ۔۔۔) "اس کی تو ایک آنکھ گئی تھی امی۔ اور آپ نے اپنی دو آنکھوں سے اسے اتنا برا دیکھا۔" وہ آگے بول نہ سکی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی اور اس کا رونا بہت تکلیف دہ تھا۔ اس لیے کہ وہ روتی ہی نہیں تھی۔

"میری بچی۔۔۔!" صفیہ اس کے ساتھ لگ گئیں۔ "میں تیری ماں ہوں تیرا برا کیوں چاہوں گی۔ تیرا جوڑ اے ڈی یا پھر اس جیسے بندے کے ساتھ ہی بجے گا۔ میں کہہ دوں گی بھائی عزیز سے۔۔۔ اتنی بڑی قیمت نہ وصولیں۔ اپنے بیٹے کے لیے انہیں اور بہت سی مل جائیں گی' میں اپنی بیٹی کو اس احسان کے بوجھ تلے دبنے نہیں دوں گی۔"

وہ اس کے آنسو صاف کر رہی تھیں۔ پچکار رہی تھیں۔ ماں کا سب سے خوب صورت روپ۔

"نہیں۔۔۔" اس نے صفیہ کے ہاتھ جھٹک دیے۔ "آپ سے کس نے کہا مجھے احسان اتارنا ہے' میں اتار بھی سکتی ہوں بھلا۔۔۔؟ مجھ روتی کو ہنسایا تھا امی ان سب نے۔۔۔" اس کا لمبا ہاتھ عبدالعزیز کے پورشن کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ "ہنسی کی قیمت کیسے ادا کروں؟ مجھے رشتے ملے تھے امی۔۔۔ خوشی ملی تھی' خوشی کا احسان اتاروں۔۔۔"

"ان سب چیزوں کو تو میں نے کبھی گنا ہی نہیں کہ اس احسان کا بدلہ اتار ہی نہیں سکتی تھی۔ احسان نہیں نیکی تھی جو تایا ابو نے ہم پر کی ہے۔ اور نیکی کا بدلہ اللہ دے گا تاکہ ہم جیسے گھٹیا انسان۔۔۔ اور آپ امی۔۔۔ آپ کم بولتی تھیں اچھا کرتی تھیں۔ آج زیادہ بول کر آپ نے کیا ستم ڈھایا۔ کوئی اپنوں کا ایسے مذاق اڑاتا ہے' اتنی بری باتیں تو غیروں کے لیے بھی نہیں کہتے۔ جھنجھنا اور ہینگر۔۔۔ آپ کی سوچ امی۔۔۔"

"تم اپنی ماں سے بدتمیزی کر رہی ہو حمیرا۔۔۔ اتنے علم نے یہ نہیں بتایا کہ ماں کو کیسے مخاطب کرتے ہیں۔"

"علم ہی نے تو زبان بند کر دی امی۔۔۔ ورنہ آپ کے خیالات کے انکشاف کے بعد کیا کیا اس دل میں آیا تھا' مگر میں آپ کی بات مان بھی نہیں سکتی۔ شادی تو مجھے **معید عبدالعزیز** سے ہی کرنی ہے۔" اس کا جملہ دوٹوک تھا۔

"کیوں۔۔۔؟" صفیہ کی اتنی اونچی آواز ان درودیوار نے بھی پہلی بار سنی تھی اور اس کے ساتھ ہی برے القابات و خطابات کا ایک نیا سلسلہ تھا جو کوہ ہندوکش کی پہاڑوں سے زیادہ پھیل گیا۔

اور خیال۔۔۔ تعفن زدہ۔ بھبکے' تنگ اور جیسے گٹر کا ڈھکن کھل جائے۔

"تمہیں میری بات ماننا ہوگی حمیرا۔ اے ڈی نہ سہی کوئی اور سہی مگر معید کبھی نہیں۔"
صفیہ خود ہی تھک کر بات ختم کرنے پر آگئیں۔
"اور یہ بات میں کبھی نہیں مانوں گی۔" وہ بھی امی کے لہجے میں بولی تھی۔
دونوں ماں بیٹی روبرو ایک دوسرے کو تکتی جاتی تھیں۔ ایسی خاموشی چھا گئی جیسے کمرے میں کوئی ہے ہی نہیں۔۔۔ پھر صفیہ ہی اٹھیں بستر درست کرنے لگیں جیسے اپنی بات ختم کرکے اب سکون کی نیند لینے کا ارادہ ہو۔
"مجھے اندازہ تھا ہمیشہ سے۔۔۔ مگر یقین آج ہوگیا۔"
صفیہ کے ہاتھ پل بھر کو رکے۔ "کس بات کا یقین؟"
"آپ حسد کا شکار ہیں امی!"
صفیہ نے تیزی سے پلکیں اٹھائیں۔ "تم اپنی ماں کو کہہ رہی ہو یہ۔"
"حسد گالی نہیں ہے۔ ایک کیفیت ہے، جو صحیح غلط کی تمیز کو بھلا دیتی ہے۔ اندھا کر دیتی ہے۔"
"بکواس بند کرو۔" صفیہ واقعی تلملا گئیں۔
"بکواس نہیں ہے امی' یہ سچ ہے۔" وہ صفیہ کی حالت کے برعکس بہت پرسکون تھی۔ جیسے کسی نتیجے تک پہنچ گئی ہو۔
"بہت بچپن میں۔۔۔ جب ہم یہاں آگئے تھے۔ مجھے تب بھی یہ احساس ہوتا تھا مگر سمجھ نہیں پاتی تھی لیکن آج میں نتیجہ نکالنے کے قابل ہو چکی ہوں تو یاد آتا ہے۔ آپ نے کبھی سمیرا کو عید شبرات پر بھی پچکار کر یہ نہیں کہا۔ "ماشاء اللہ بڑی پیاری لگ رہی ہو۔" میرے متوجہ کرنے پر بھی یا تو ان سنی کر دیتی تھیں۔ یا پھر اک سرسری نگاہ پر ڈال کر ہاں ہاں کہہ کر جان چھڑا لیتی تھیں اور میں سوچتی تھی۔
میرا ماتھا جس طرح بڑی امی چومتی ہیں آپ نے تو کبھی اس طرح سمیرا کو پیار نہیں کیا۔ معید کو آپ نے پھر بھی نظر بھر کے دیکھا شاید اس کی وجہ تایا ابو کی خواہش رہی ہو۔ مگر خیر بعد میں تو آپ نے اس کا صفحہ ہی پھاڑ دیا گویا۔
"بلاوجہ کے اندازے مت لگاؤ حمیرا۔" صفیہ نے رعب سے کہا۔
مگر حمیرا کا دھیان نہیں تھا۔ وہ دیوار پر لکھا سبق پڑھ رہی تھی جیسے۔
آپ نے ہمیشہ مجھے سمیرا جیسا بننے کی ترغیب دی۔ مجھے گہرے شوخ رنگ پسند تھے۔ آپ میرے لیے زبردستی ہلکے رنگ لاتیں۔ اور پرزور اصرار سے پہناتی تھیں۔ میں بازار میں اپنی پسند کی چیز پر ہاتھ رکھنا چاہتی تھی۔ اور آپ کن انکھیوں سے سمیرا کو دیکھتیں کہ وہ کیا لینا چاہتی ہے۔ وہ کیا کھاتی ہے۔ کیسے رہتی ہے۔ موٹی ہے۔ پتلی ہے' اچھی ہے بری ہے۔ آپ نے ہمیشہ مجھے اس جیسا بنانا چاہا۔ یہ سوچے بناء کہ میں ایک الگ انسان ہوں۔ میری سوچ' انداز رویے دوسرے انسان سے یقیناً" الگ ہوں گے۔ آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں خود سے کیا چاہتی ہوں۔ میری اپنی ایک شخصیت ہے۔ اور اپنی قسمت۔
والدین اولاد کی خوشی کے لیے ہر حد پھلانگ جاتے ہیں۔ مگر یہ کیا کہ آپ سمیرا سے خوشیاں چھین کر میری جھولی میں ڈال دیں۔ اور صرف سمیرا کا رونا کیوں۔۔۔ آپ کو اندازہ ہے آپ کی بھائی ریاض والی بات اگر پوری ہو جائے یعنی میری اور بھائی ریاض کی شادی' اس نے بدقت کہا۔ (جو بات کہنی اتنی مشکل ہو اس پر عمل کتنا کٹھن ہوگا) تو تایا ابو کے دونوں بچے آزردہ ہوں گے۔ آپ دونوں سے ان کی خوشیاں چھین لینا چاہتی ہیں اور ان کو بھی چھوڑیے۔ ان سے تو بلاجواز دشمنی نباہنا تھی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ میں کتنی ناخوش ہوں گی۔"
"معید۔۔۔ تمہاری خوشی کب سے بن گیا۔" صفیہ نے دانت پیسے تھے۔
"ہمیشہ سے امی۔۔۔" اس کے لہجے کی تیزی نے صفیہ کو حیران کر دیا۔
"اس کا حال دیکھا ہے تم نے۔"
"ہاں کیا ہوا اسے؟" وہ واقعی معصوم تھی یا۔۔۔ بے وقوف' اندھی۔

"یہ نہیں ہو سکتا حمیرا۔"

"یہ ہو کر رہے گا امی۔"

اس میں کیا بچا ہے جسے سمیٹنے کے لیے اپنی عمر گھلانی ہے۔" صفیہ سر پیٹ لینا چاہتی تھی۔ ملبہ' کھنڈر.... ڈھانچہ رہ گیا ہے صرف۔"

"ملبے پر دوبارہ گھر کھڑا کر لیا جاتا ہے۔ کھنڈر رات بستیوں میں بدل جاتے ہیں۔" وہ مسکرائی تھی۔

"میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم معید کا نام لو گی اور وہ بھی اس طرح۔" صفیہ کی حیرت بجا تھی۔ لڑکیاں تو بڑے ہیرو ٹائپ کے آئیڈیل شریک حیات کا خواب دیکھتی ہیں۔

"وہ مجھے اچھا لگتا ہے امی۔"

"اس حال میں۔"

"ہر حال میں امی۔"

"کیوں؟" حمیرا کی نگاہیں بے ساختہ اٹھیں۔ چمکتی آنکھیں.... مسکرائیں۔

"ہاں یہ سوال آپ نے صحیح کیا۔ کیونکہ یہ میں نے خود سے بھی کئی بار کیا ہے پر جواب نہیں ملا' وہ ہمیشہ سے اچھا لگتا ہے۔ اتنا کہ میں نے اس کے علاوہ کبھی کسی اور کو سوچنا تو دور نظر بھر کے دیکھا بھی نہیں.... اور دیکھنے کو بھی چھوڑیں.... نظر ہی نہیں اٹھی۔"

صفیہ کا منہ کھل گیا.... کون بیٹی ہو گی جو ماں کے سامنے اس طرح دل کھول دے مگر وہ حمیرا عبدالمجید تھی۔ جو سوچا کہہ دیا۔

"اے ڈی نہ سہی.... مگر معید کبھی نہیں...." بہت دیر بعد صفیہ بول سکیں۔ سمیرا کے لیے اے ڈی جیسا شوہر اور حمیرا کے لیے معید۔ ناں" صفیہ کے انداز کی قطعیت اور بے رحمی خوفناک تھی' وہ مسلسل دائیں بائیں گردن ہلا رہی تھیں۔

سمیرا کے لیے اتنا تضحیک آمیز انداز کیوں اپناتی ہیں امی۔ کوئی فرق نہیں ہے سمیرا اور حمیرا میں.... یا پھر یہی کہ وہ حسد جو برباد کر دینا سکھاتا ہے اور۔" حمیرا حسد کو مزید واضح کرنے لگی تھی۔ مگر....

صفیہ کے ایک تھپڑ نے اس کا منہ بند کر دیا۔ اس کا ہاتھ.... بے ساختہ گال پر ٹھہرا تھا۔ حیران نگاہیں ماں کی جانب اٹھی تھیں جو غضب ناکی کی حد پر پہنچ کر بے قابو ہو گئی تھیں۔

"خبردار جو دوبارہ میرے سامنے یہ حسد.... حسد کی بکواس کی.... نہیں ہوں میں حاسد.... ہے کیا ان ماں بیٹی میں جو میں ان سے حسد کروں گی۔ اور تمہیں شرم نہیں آتی ماں کے لیے مسلسل یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے۔ تم جیسی اولاد...." صفیہ کی آواز یک دم گھٹی۔ بیٹی عجیب سی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"میں تو صرف سمیرا کے نام سے حسد کا اندازہ لگا رہی تھی۔ پر آپ تو ماں بیٹی کا لفظ استعمال کر رہی ہیں۔ تو کیا بڑی امی سے بھی؟"

"حمیرا....!" صفیہ کے شانے جھک گئے۔

"میں بچی نہیں ہوں امی.... میں نے تو بہت کم عمری سے چیزوں کو سمجھنا شروع کر دیا تھا۔"

"میں حاسد نہیں ہوں۔ میں کسی سے حسد نہیں کرتی۔" صفیہ خود سے ہم کلام تھیں جیسے۔ مگر انداز ایسا تھا جو در اصل قبول کرنے کا انداز ہوتا ہے۔

"امی۔!" حمیرا اپنا گال کو سہلا کر ان کے نزدیک سرکی صفیہ کے ہاتھ نرمی سے تھامے۔ صفیہ کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔" لیکن۔ سمیرا اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور انہیں کسی قدر پیچھے ہٹاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ وہ حیران رہ گئی۔

اور پھر ساری رات برآمدے کی جالی سے منہ جوڑے وہ چوہے بلی کا کھیل دیکھتے ہوئے ان القابات و جملوں کو یاد کر کے روتی رہی جو صفیہ نے معید کے لیے کہے تھے۔ گھٹیا' جھنجھنا' ملبہ' کھنڈر' ہینگر اور ڈھانچہ اتنی ساری باتیں۔

اتنا تکبر' اتنا غرور۔



"چچی کے دل میں کیا تھا اور کیوں تھا کو چھوڑیں.... حمیرا ایسی نہیں ہے۔" سارا قصہ سن کر سمیرا کے لبوں سے بے ساختہ گواہی نکلی۔

"لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ لاکھ چیخے گی۔ محبت کے دعوے کرے گی مگر تمہارے ابو کبھی نہیں مانیں گے۔" بڑی امی شوہر کے مزاج اور فیصلوں سے واقف تھیں۔

"کیا نہیں مانیں گے؟" سمیرا سمجھی نہیں۔

"یہی.... حمیرا اور معبد کی شادی۔"

"اوہ...." سمیرا کو سب یاد آگیا۔

"جب وہ صفیہ اور حمیرا کو یہاں لائے۔ بہت دکھی تھے۔ بھائی کے لا ابالی پن.... پڑھنے لکھنے سے عدم دلچسپی گاڑیوں اور ریسوں کے شوق میں پڑ کر وہ الگ ہی مزاج کا بن گیا تھا۔ اس کا حلقہ احباب بالکل الگ تھا۔ باقی خاندان کے لوگوں کی نسبت.... کچھ بڑے بزرگ تو اسے صاف آوارہ کہتے تھے۔ حالانکہ یہ آوارگی نہیں تھی بلکہ بس وہ ذرا الگ مزاج کا تھا۔

اور پھر جب اس نے صفیہ سے شادی کی۔ انہیں صفیہ پر اعتراض تھا۔ ایک اتنی ہٹ دھرم لڑکی اچھی بیوی ثابت نہیں ہوگی جو ماں باپ کے سامنے اکڑ جائے انہیں اتنا مجبور کردے۔ تو اس سے کیا امید کی جاسکتی ہے۔ ہاں بعد میں.... یعنی اب وہ صفیہ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اس نے واقعی عبدالمجید سے محبت کی تھی اور بیوہ ہونے کے بعد بھی باقی کی ساری زندگی جس عزت سے اس کا نام سنبھالتے ہوئے گزاری' وہ قابل تحسین ہے۔

مگر اس وقت عبدالمجید کے انتقال کے بعد.... وہ بھائی سے خفا تو تھے۔ مگر کوئی تعلق تھوڑی ختم ہوا تھا۔ خون کا رشتہ تھا یہ....

وہ اپنا حصہ لڑ جھگڑ کر لے جاچکا تھا۔ یہ سارا گھر اب تمہارے ابو کا تھا۔ مگر انہوں نے اگلی ہی صبح.... مزدور بلوا کر گھر کے بیچ دونوں ماں بیٹی کے لیے باقاعدہ پورشن بنوا دیا۔ ساری ضروریات و سہولیات کو مدنظر رکھ کر.... کچن بنایا مگر ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ وہ چاہتے ہیں گھر میں ایک ہی دستر خوان لگے۔ اور ان سب چیزوں کو دیکھ کر صفیہ بے یقین رہتی تھی۔

لوگ' رشتے دار آآکر پوچھتے تھے۔ عبدالمجید تو اپنے حصے سے بڑھ کر لے چکا تو اب یہ سب؟ تمہارے ابو اپنے دل پر ہاتھ رکھتے۔

"وہ زمین کا حصہ تھا۔ اور یہ میرے دل کا حصہ ہے۔"

صفیہ کی شادی کے لیے اٹھائے گئے قدم.... حمیرا کی منزل کھوٹی کرسکتے تھے۔ بڑی کھوجتی نظروں سے دنیا حمیرا کو دیکھتی تھی۔ اس کی شوخیوں و شرارتوں کو آنے والے وقت میں ماں جیسی ہونے کے گمان میں جانچتے۔ تب تمہارے ابو نے اعلان کردیا' وہ حمیرا کو اپنی بہو بنائیں گے۔

اور تب ہی میں نے پہلی بار صفیہ کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ سکون بھی ابھرتا دیکھا تھا۔ اسے تمہارے ابو کی محبت و خلوص پر یقین آگیا تھا۔ لیکن۔" بڑی امی خاموش ہوگئیں۔

سمیرا بھی جانتی تھی۔ قصے کو کہاں آکر رک جانا تھا۔ اسی لیکن پر....

سمیرا نے قصداً" منہ پھیر لیا۔ ماں دو چار دن سے مسلسل رو رہی تھیں۔ مگر اب جو نمی آنکھوں میں تیر رہی تھی۔ اور بہہ جانے کو تھی۔ وہ بیٹے کے لیے تھی اور وہ اس کے حوالے سے کبھی نہیں روتی تھیں۔

بس ایک بار۔ بس ایک بار روئی تھیں۔ ویسے جیسے کہ ماؤں کو جوان بیٹوں کے مرنے پر رونا چاہیے۔

ابھی کچھ دن پہلے تو کالج میں داخلہ لیا تھا۔ ابھی ہفتہ پہلے تو اس کے سارے تنگ ہوجانے والے کپڑے نکال کر نئے سائز کے کپڑے' جوتے بنوائے تھے۔

اتنا لمبا' تنومند' باڈی بلڈر جیسا گلال سرخ گالوں' سنہرے بال اور اور چمکتی شریر آنکھوں والا بیٹا.... اور لوگ کہتے ہیں' وہ اب نہیں ہے۔

وہ حالت رکوع کی طرح جھکی تھیں اور اللہ' پکارتی ہوئی سیدھی کھڑی ہوئی تھیں اور آسمان کو دیکھ کر روتی چلی گئی تھیں۔

مگر پھر جب انہیں پتا لگا۔ نہیں.... ان کا بیٹا زندہ ہے۔ تب انہوں نے آنسو پونچھ لیے.... اور پھر کبھی نہیں روئیں.... جس اللہ نے اس حال میں زندہ رکھا

تھا۔ وہ آگے بھی بچالے گا۔
مگر آج اتنے سالوں بعد آنکھوں میں آتی یہ بے بس نمی بیٹے کے لیے تھی۔ بیٹا معید عبدالعزیز۔
کرچیاں دوبارہ نہیں جڑتیں... لیکن اگر اللہ جوڑے تو... اس سے کیا ناممکن ہے۔ کیا چیز ہے جو اس کے اختیار میں نہیں۔
جب انسان کے لیے دنیا میں سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ تب اللہ شروع ہوتا ہے۔ تو صرف اللہ... کیا اللہ... واہ اللہ۔
وہ... وہ معید عبدالعزیز نہیں رہا تھا۔ وہ شہزادوں جیسا۔
مگر شہزادہ... شہزادہ ہوتا ہے۔ لگنے کی کیا بات ہے۔
وہ بظاہر بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہاں دبلا پتلا تھا۔ پائلٹ نہیں بن سکا تھا افسر بھی نہیں بنا۔
اور صفیہ... جب ناہید، بیٹے کو سہم کر دیکھتی تھیں۔ ماں تھیں ناں... وہ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔
تب صفیہ... بھی ماں تھیں ناں... بیٹی کی ماں۔
اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ عبدالعزیز جیسے حساس اور محبت کرنے والے انسان ایک ماں کی آنکھ کا خوف نہ پڑھتے۔
خدشات... جو چیخ چیخ کر کہتے تھے۔ "پیاری بیٹی کے لیے کیا یہ معید عبدالعزیز؟"
اور تب ایک رات عبدالعزیز نے ناہید کو مخاطب کر کے کہا۔ وہ اپنے خواب سے دستبردار ہوتے ہیں۔
وہی خواب مرحوم بھائی کی بیٹی کو بہو بنا کر ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھنے کا خواب۔ وہ کیسے اتنے ظالم ہو سکتے ہیں کہ... اپنے بیٹے کی حالت کو نظر انداز کر دیں۔
"وہ ٹھیک ہو جائے گا۔" ناہید کا یقین پہاڑوں سے بڑھ کر تھا۔
"لیکن اگر نہ ہوا تو...؟"
"تو تب کی تب دیکھی جائے گی۔" ناہید حقیقت پسند بھی ہو چکی تھیں۔
"لیکن میں اپنے اور تمہارے اور بالخصوص معید کے ذہن میں یہ بات ڈال دینا چاہتا ہوں کہ ضروری نہیں ہر خواب تعبیر پالے۔"
"وہ ٹوٹ جائے گا۔" وہ تھیں تو ایک ماں ہی۔
"نہیں..." وہ مسکرائے۔ "میرا فیصلہ، یہ اعلان... اسے جڑنے میں مدد دے گا۔ تم دیکھ لینا۔"
اور تھا تو معید عبدالعزیز بھی ان کا بیٹا... پھر ان جیسا کیسے نہ ہوتا۔ وقت گزرا... وہ جڑ گیا... ٹھیک ہو گیا۔
لیکن اس نے اپنے قدم خود بخود پیچھے کر لیے۔ نظریں پھیر لیں... حمیرا کا حق تھا اسے اس جیسا قابل اور کامل شریک حیات ملے۔ وہ خود بہت اچھا تھا۔ بہت پیارا بھی... سامنے سے دیکھنے والا کوئی بھی شخص نہیں بتا سکتا تھا کہ جسم کتنی شکست ریخت کے بعد جڑا ہے۔
"ہاں یہ ضرور غلطی ہو گئی کہ ہم نے صفیہ کو نہیں بتایا۔ بتا دیتے تو شاید وہ ایسی منصوبہ بندیاں نہ کرتی۔ لیکن سمیرا...! اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود وہ اجنبی کی اجنبی ہی رہی۔ ہم اتنے سال ایک ساتھ ایک چھت کے نیچے رہے۔ مگر ہم نے کبھی ایک دوسرے سے دل کی باتیں نہیں کیں۔ نہ میں نے... یا پھر میں کرنا بھی چاہتی تھی۔ پر وہ اپنے دائرے سے کبھی باہر نکلی ہی نہیں... پتا نہیں کیا وجہ تھی۔ میں نہیں سمجھ سکی"۔
بڑی امی نے یہ الجھن بھی بیٹی کے آگے کھول دی۔ سمیرا نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"اتنا مت سوچیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"
"چھوڑو میری طبیعت کی خرابی کو..." وہ سخت بے زار و پریشان لہجے میں بولیں۔
"یہ جو اتنا سب کچھ خراب ہو گیا ہے... یہ کیسے ٹھیک ہو گا۔"
"کیا خراب ہو گیا؟" وہ فوری طور پر سمجھ نہ سکی۔
"یہی سب۔"
"بھولی کا ذہن... صفیہ کی سوچ۔ اور وہ حمیرا..."
اس نے جس بے یقینی اور صدمے سے تصدیق چاہی

تھی کہ اس کا رشتہ ختم کیا جا چکا ہے وہ بھی چھ سال پہلے اور اسے خبر بھی نہیں۔۔۔ اور تمہارا کیا ہو گا سمیرا۔۔۔ اگر اے ڈی بھی ماں کا ہم خیال نکلا تو۔۔۔" سمیرا کے منہ سے ٹھنڈا سانس خارج ہوا تھا۔

کیا اے ڈی ماں کا ہم خیال ہو سکتا تھا؟

معید کے حادثے کے وقت وہ انٹر میں تھی۔ بہت خواب تھے اس کے مستقبل کے حوالے سے' سب سے پہلے تو وہ اعلا تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اے ڈی کی طرح۔۔۔ وہ بھی استاد بننا چاہتی تھی۔

مگر معید کے حادثے کے بعد اس نے استادوں کی ایک نئی قسم کو دیکھا اپاہج انسانوں کو زندگی جینا سکھانے والے استاد۔

اس کے دل نے کہا' وہ یہ پیشہ چنے گی۔ تب اے ڈی ہی نے تو اسے سب سمجھایا تھا اس حوالے سے تعلیم اور پھر تربیت حاصل کرنا اور پھر عملی اقدام۔۔۔ بہت کم لوگ اس پیشے کو اپناتے تھے۔ یہاں خدمت خلق کا جذبہ لے کر جانا پڑتا تھا۔

اور آمدنی۔۔۔ اگر ایسا کوئی خیال تھا تو پھر آپ رہنے دیں۔۔۔

اور اے ڈی ان سب باتوں سے واقف تھا۔ اگر وہ مادیت پرست ہوتا تو وہ سمیرا کو کبھی اس شعبے میں جانے نہ دیتا۔

کوئی ایسا کام بتاتا یا پڑھواتا جس کے بدلے میں اچھی تنخواہ اور فوائد حاصل ہو سکیں۔

(ہاں اس نے حمیرا کو اس کی دلچسپی کے پیش نظر ہی میتھس پڑھوایا تھا۔ اور وہ اتنی قابل تھی کہ گولڈ میڈل حاصل کر کے آج ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ کی افسر بن گئی اور تنخواہ پوری انچاس ہزار پانچ سو) تو ثابت ہوا اے ڈی کی سوچ ماں جیسی نہیں ہے۔

اسے صرف سمیرا سے دلچسپی تھی۔ نہ کہ سمیرا کے ہنروں سے (سمیرا فی سبیل اللہ کام کرتی تھی)

کیا اس کی سوچ بھی بدل گئی تھی۔ انسانوں کی سوچ بدلتے کتنی دیر لگتی ہے۔ محبتوں میں کتنا بھی یقین ہو'

دل کو دھڑکا تو رہتا ہی ہے۔



وہ جھٹکے سے سنبھلی تو گھر لوٹی نہ تایا ابو تھے نہ تایا کا بیٹا۔۔۔ اتنی صبح کہاں ہوں گے۔ اس نے قیاس کے گھوڑے دوڑائے۔ گلی سے گزرتے چنگ چی رکشے کی سائیڈ کرسی پر آدھا ادھورا اٹک کر مین بازار پہنچی۔

معید کا اسٹور صبح صبح ہی کھلتا تھا۔ مگر وہ گیارہ بجے کے قریب جایا کرتا تھا۔ ملازمین صبح کا کام دیکھتے تھے۔ مگر آج۔۔۔ "اوہ۔۔۔" معید کی چھوٹی آلٹو باہر موجود تھی۔ اس نے دانت کچکچائے۔

بڑے سے گلاس ڈور سے اسٹور کا اندرونی منظر صاف دکھائی دیتا تھا وہ سامنے ہی براجمان کسی سے محو گفتگو تھا۔ پھر اس نے "کسی" کو بھی دیکھ لیا۔ اوہ دونوں مجرم' ایک ہی جگہ مل گئے تھے۔ ویری ویری گڈ۔۔۔ دروازہ بے آواز تھا۔ وہ بھی سر پر پہنچ کر دھماکا کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس سے پہلے خود بولنا شروع کر دی۔ کان خود بخود سننے لگے۔

عبدالعزیز کچھ کہہ رہے تھے۔ بتا رہے تھے' وہ حمیرا کو جانتے ہیں۔ وہ کسی سے بھی شادی کر لے گی مگر اے ڈی سے کبھی نہیں کرے گی۔

مگر جواب میں' جو معید نے بولنا شروع کیا۔ وہ حیران کرنے کے بعد آگ لگانے والے اندازے تھے۔ کیسی بے فکری تھی اس کے انداز میں۔ اور اس نے سوچا بھی کیسے کہ وہ۔۔۔

"تم نے سوچا بھی کیسے کہ۔۔۔ میں سمیرا سے اے ڈی چھین لوں گی۔" اس نے میز پر ہاتھ مارے تھے۔

"آپ بیچ میں سے نکل جائیں تایا ابو۔۔۔! آپ سے میں بعد میں بات کروں گی۔"

وہ ہنوز معید کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ عبدالعزیز کو بھی دیکھے بغیر حکم جاری کیا۔ اس کے انداز کی قطعیت دیکھ کر عبدالعزیز نے باہر نکل جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ اور وہ ان کے نکلنے ہی کی منتظر تھی۔ اس نے اسٹور کے گلاس ڈور کو لاک کر دیا۔ ساتھ ہی

وقفہ برائے نماز۔ کا پلاسٹک ٹیگ لٹکا دیا۔

''اس وقت کون سی نماز ہوتی ہے؟'' معید کی آواز ابھری۔ وال کلاک پر گیارہ بجے تھے۔

''نماز جنازہ۔'' وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر اس کی سمت گھومی تھی۔

''کس کی؟'' اس کا سوال عین فطری تھا۔

''تمہاری۔'' وہ تین قدموں میں اس کے سر پر پہنچی تھی۔

''میری....؟'' وہ واقعی دہل گیا۔ ''ایسی جوان عمر میں۔''

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے شادی سے انکار کرنے سے۔''

معید کی بولتی بند ہوگئی۔ اسے مزید آگ لگی۔

''اب بولتے کیوں نہیں چپ کیوں لگ گئی ہے؟'' اس نے لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ اس کے منہ کے سامنے کر کر کے پوچھا۔

''تو تم کو مجھ سے شادی کرنی تھی۔'' معید کے لہجے سے پتا لگتا تھا وہ ابھی تک حمیرا کے موڈ کا اندازہ لگا نہیں سکا۔

''جی ہاں۔'' حمیرا نے لمبا سانس اندر کھینچا گویا غصہ پیا۔ صبر کا گھونٹ پیا۔ ''کنیز یہی چاہتی تھی۔''

''تو پھر کنیز کو بھیجو.... تم کیوں کھڑی ہو۔'' شاہانہ لہجہ اختیار کیا۔

''کنیز کے بچے....'' ضبط کی حد یہیں تک تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ معید کے شانے پر زور سے مارا۔ بے چارہ بمشکل سنبھلا۔ کرسی ہل گئی تھی۔

''تم نے میرے بارے میں اتنا غلط سوچا کہ میں اے ڈی بھائی سے۔ اتنی گھٹیا بات۔'' اسے اس سوچ پر ہی گھن آئی تھی۔

''میں نے سوچا....'' وہ غرائی ''تم میں اگر سوچنے کی صلاحیت ہوتی تو کسی مقام پر ہوتے اس اسٹور میں نہ بیٹھے ہوتے۔''

معید کے ہلکے پھلکے موڈ پر اس جملے کا اثر ہوا۔ اب کی بار اس نے نگاہ اٹھائی تھی۔ سنجیدہ دو ٹوک۔ قطعیت سے بھرپور۔

''بس یہی بات تھی۔ کہ مجھ میں واقعی کوئی صلاحیت بچی ہوتی تو میں بھی کچھ اچھا سوچتا پھر میں نے یہی سوچا کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ تم کسی بہت اچھے ''قابل'' مکمل انسان کو ڈیزرو کرتی ہو جو تمہارے لیول۔''

''تم ہوتے کون ہو میرا لیول طے کرنے والے۔ اور میں نے کب تم سے گزارش کی کہ تم میرے لیے ''قابل'' انسان ڈھونڈو'' وہ پھٹ پڑی۔ ''میں اپنا اچھا برا سمجھتی ہوں۔''

''اور تمہیں اپنے لیے جو ''اچھا'' لگا وہ میں ہوں۔'' اس کے سوال کی کاٹ جان لیوا تھی۔ پر آگے بھی تو حمیرا عبدالمجید تھی جس نے زور و شور سے سر ہلایا۔

''ہاں!''

''احسان اتارنے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔''

''احسان؟'' وہ چونکی۔

''ہاں وہی احسان.... جو ابو نے کیا۔ وہی سب باتیں جو چچی کہہ رہی تھیں قیمت.... ان کا اپنا انداز تھا.... تمہارا اپنا.... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ضرورت نہیں.... وہ ابو کی اپنے مرحوم بھائی سے محبت تھی اور قرض بھی.... تمہیں اس فکر میں گھلنے کی ضرورت نہیں۔ کہ تم ترس کھاؤ.... اور میں تو حیران ہوں۔ تم ایسا ردعمل ظاہر کر رہی ہو۔ ہمارے درمیان تو کبھی بھی ایسا کچھ نہیں رہا۔''

وہ حمیرا کی پھٹی آنکھوں اور فق ہوتے رنگ سے بے پرواہ ہو کر اپنی کہہ رہا تھا۔

''یاد نہیں.... جب ایک بار تمہیں کہانی لکھنے کا جنون ہوا تھا۔ میں تو کہانی میں بھی تمہارا ہیرو بننے کا اہل نہیں تھا۔ تم مجھے ریئل ہیرو کہہ رہی ہو۔ کمال ہے یار۔'' اس نے بے پروائی سے بالوں میں ہاتھ چلایا اور مسکرایا بھی تھا۔ دوستانہ مسکراہٹ کتنے مزے سے لاعلم۔ کتنا پرسکون۔

وہ ہمیشہ سوچتی تھی۔ چنگیز خان کھوپڑیوں کے مینار کی بلندی دیکھ کر مسکراتا تھا۔ تو کتنا ظالم تھا جو ایسے عالم میں

مسکرا سکتا تھا؟ یہ سامنے بھی تو چنگیز خان ہی تھا' مارچ دو ہزار سولہ کا ہلاکو خان..... تاتار اعظم۔
اسے مار رہا تھا..... اور ہنس رہا تھا۔
اور سچ بھی کہہ رہا تھا۔ ان کے بیچ کب تھے وعدے وعید.... نظر' حق' مسکان لیکن جب وہ کہہ رہی ہے اپنے منہ سے۔ تو مانتا کیوں نہیں۔
کوئی لڑکی کا دل ایسے توڑتا ہے۔ کہ لڑکی اس پر مرتی رہے اور وہ.....
اسے سب کچھ سنا کر دوبارہ اخبار بنی؟ کیا اپنی قبل از وقت وفات کی خبر مل گئی تھی۔
"ظالم کمینے!" اس نے دانت کچکچائے۔ اور اگلے ہی لمحے میز پر پڑے سارے اخبار' نوٹ بکس' کتابیں اس پر برسادیں۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا۔ اپنے سامنے والا ریک خالی کردیا۔ پھر اس کے پیچھے والا۔ اس کی روزی روٹی پر لات مارنے والی بات تھی یہ.....
بے چارے کا بک اسٹور..... ردی کی دکان بن جائے گا اگر اسے بروقت روکا نہ گیا۔ اور بھلے سے دروازہ اندر سے لاک تھا۔ مگر تھا تو شیشے کا.... ابھی جم غفیر لگ جاتا.... کاروبار کا خسارہ.... اور عزت کا کچرا.... نہیں بھئی۔ خود کو کتابوں' کاپیوں کے وار سے بچاتے اس نے بمشکل اس کے دونوں ہاتھ تھامے مگر کدھر جناب' وہ حمیرا۔ اسے سنبھالنا اتنا آسان کہاں تھا۔ اس نے ہاتھ پکڑے ہوئے اسے گھمادیا۔ پشت سے کس لیا۔ تب وہ جکڑی گئی حرکت کی محتاج ہائے بے چاری۔ پھڑپھڑا کر رہ گئی۔
"چھوڑو' مجھے۔" وہ جھنجلائی۔
"مجھے چھوڑو معید....." وہ بہ وقت گردن پیچھے کر کے بولی۔
اس کی آنکھوں میں حزن کی کیفیت چھ برس سے ٹھہر گئی تھی مگر ایک شوخی کا لپکا تر چھی نگاہ سے مخفی نہ رہ سکا۔ یہ دیکھ کیسے رہا تھا۔ اور مسکرا کیسے رہا تھا۔ ایسے تو کبھی نہیں مسکرایا۔
"ابھی تو اس بات پر قیامت برپا کردی تھی کہ تمہیں چھوڑنے کی بات ہی کیوں کی اور اب کہتی ہو چھوڑ دو۔" اس کا لہجہ بھی بدلا تھا۔
"وہ دوسرا چھوڑنا تھا۔" اسے وضاحت کرنی مشکل لگی۔
"چھوڑنا..... چھوڑنا ہی ہوتا ہے۔ تم طے کرلو۔ پکڑے رہوں یا چھوڑ دوں۔" اتنے معنی خیز جملے.... حمیرا کو قربت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ پوری جان سے کسمسائی۔ مگر کہاں جی۔ ایسے ہی بڑی امی کہتی رہتی ہیں۔
"میرا کمزور بچہ..... جان نہیں پکڑتا جسم.... اب کیا کنگ کانگ ہوجائے۔"
"میں رو پڑوں گی۔"
"پرواہ نہیں....."
"مجھے درد ہو رہا ہے معید...." اس کی آواز سے بھی عیاں ہوا۔
"اوہ۔!" معید نے شکنجہ کھول دیا۔ وہ سرعت سے پلٹی' اب دونوں روبرو تھے۔ وہ مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ یہ گھور رہی تھی اور اپنے ہاتھ مسل رہی تھی۔
"زیادہ درد ہو رہا ہے۔" وہ ایک قدم آگے آیا۔ وہ کچھ نہ بولی۔
"حمیرا۔!" اس نے نرمی اور فکر مندی سے پکارا تھا۔
اس درد سے' بہت کم جو لوگوں کے انکار سے ہوا۔" معید بہت محتاط انداز سے اپنی شہادت کی انگلی سے ہاتھ کے سرخ نشان کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں جہاں صرف سچ کی تحریر تھی۔
"تم واقعی سچ کہہ رہی ہو؟" وہ اس سے کیا سننا چاہتا تھا۔ دکھائی تو صاف دے رہا تھا۔ پھر بھی اس نے سرہلا دیا۔
"احسان..... یا محبت....؟" اسے وضاحت درکار تھی۔
"محبت....." اب جب کہ بات صاف ہونے لگی تھی۔ تو پھر وہ کیوں رکتی۔
"کیا....."
"محبت۔" اس نے جواب دہرایا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔"
"کس بات کا...؟" حمیرا الجھی۔
"محبت کا... واقعی؟" اس نے سینے پر ہاتھ لپیٹ کر اسے تسلی سے جانچا۔
وہ پہلی بار چونکی۔ تو حاصل کیا ہوا خسارہ... محبت بھی نہ ملی اور پندار بھی جاتا رہا۔
شکستگی کے احساس نے اسے لڑکھڑا دیا۔ اس نے کرسی کی پشت کو دونوں ہاتھوں سے تھاما پھر گھسیٹ کر بیٹھ بھی گئی۔ سر بھی جھکا دیا۔ تو یعنی ہار مان لی۔
اس کی آنکھیں بھرنے لگیں۔ یہ کنارے تک... پھر بہہ پڑیں... گالوں سے بے آواز سیل رواں گزرنے لگا۔
اور یہ منظر دیکھنا دل گردے کا کام تھا۔
"حمیرا...!" وہ بھی کرسی کھسکا کر نزدیک آبیٹھا۔
"دنیا جینے نہیں دے گی۔" اس نے بالآخر اصل خدشہ بتا دیا۔ "جوڑ بھی تو دیکھو، تم اور میں... اچھے لگیں گے کیا ساتھ ساتھ۔"
وہ چہرہ نیچے کیے اس کا چہرہ دیکھنے کی تگ ودو میں تھا۔ اس نے جھکے جھکے نظر اٹھائی اور معید عبدالعزیز کو دل پر آرے چلنے کا مطلب سمجھ میں آگیا۔
"تمہیں بڑے لوگوں کو جواب دینے پڑیں گے۔"
وہ ہارنے لگا تھا۔ حمیرا نے سر اٹھا کر اسے بغور دیکھا۔
"دنیا مذاق اڑائے گی۔ اور تمہیں پاگل کہے گی، بے وقوف پکارے گی۔ تمہیں زیادہ سننا پڑے گا۔ ابھی تم پر جوش سوار ہے اور ہوش تب آئے گا جب وقت گزر چکا ہوگا۔ میں تمہیں عقل دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔" اس نے اس کے سر پر ہاتھ سے دستک دی۔
"میں تم سے عقل مانگنے کب آئی تھی؟" اس نے شاکی نگاہ سے اسے دیکھا۔
"مجھے کبھی بھی اندازہ نہیں تھا کہ تم مجھ سے ایسے سوال کرنے آؤ گی۔"
"اور میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ تم صاف جواب دے دو گے۔"
"نہیں تمہارا اس بے وقوفی میں ساتھ نہیں دے سکتا۔" یہ وہی جانتا تھا اس نے کس دل سے یہ جملہ کہا تھا۔ "اور کیا گارنٹی ہے کہ تم کبھی پچھتاؤ گی نہیں۔"
"کوئی محبت کے لیے بھی گارنٹی مانگتا ہے؟" سمیرا نے اسے شرمندہ کر دیا تھا۔ "گارنٹی تو میرے پاس اپنی زندگی کی بھی نہیں ہے۔" اس نے حقیقت بتلائی۔
"ہا...!" معید نے لمبا سانس بھر کے اس کے چہرے پر نگاہیں جمائیں۔ "تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ بہت پُرسکون نظر آنے لگا تھا۔ "مجھے قبول ہے۔"
"کیا؟"
"وہی جس کی تم قسم کھا کر آئی تھیں۔ مر جاؤ گی یا مار دوں گی۔ محبت یار!"
وہ بے فکری سے ہنسا۔ حمیرا نے چونک کر اسے دیکھا پر اس کی بات کی گہرائی کو جانا۔ تو کیا اس نے؟
اس کی پُرشوق نگاہیں حمیرا کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ پھر یہ کیا...؟ وہ تو بھاں بھاں کر کے رونے لگی تھی۔
اس کا تو خیال تھا وہ خوشی سے اچھل پڑے گی۔ اور وہ کتنا برا روتی تھی۔ معید اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور خود سے عہد باندھا۔ وہ زندگی بھر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں آنے دے گا۔ قسم سے۔ اتنی بری شکل۔



پھپھو بھولی معافی مانگنے آئی تھی۔ اپنی غلطی بھی تسلیم کر لی تھی۔ اور وہ بھی اپنے مخصوص انداز سے۔
"ساری زندگی پھول بوٹے بناتی رہی۔ رنگوں کو سجاتی رہی۔ لوگ لال کے ساتھ ہرے پتے بناتے تھے، میں نے کالے پتے بنا کر بھی کپڑے سجا لیے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ اللہ دتا میں نے مینٹل منٹ کی... وہ جو عطیہ نے کہا تھا اماں کرتی ہیں۔"
"اماں... ایکسپر منٹ..." اے ڈی نے نرمی سے کہا۔
"ہاں وہی ایکسپر یس منٹ..."
سب نے ہنسی چھپائی۔
"مجھ بے وقوف کے ذہن میں خیال ہی نہ آیا کہ

اے ڈی کے ساتھ تو سمیرا نے ہی بجنا ہے۔ اب بھلا یہ حمیرا اتنی موٹی ناک والی لڑکی جچتی میرے اللہ دتا کے ساتھ۔۔۔ حمیرا پر ستم توڑا حمیرا ہی سے پوچھا۔

"کمال کر دیا پھپھی!" معید نے قہقہہ لگایا۔

"آپ سچ کہتی ہیں صرف ناک ہی کیوں؟ میرے جیسی آنکھوں والی لڑکی بھی آپ کے اللہ دتا کے ساتھ نہیں سجتی تھی۔" حمیرا نے آنکھیں بھینگی کر کے دکھائیں۔

"اوئی۔۔۔!" پھپھی یوں بدکیں جیسے۔۔۔ کسی نے سوئی چبھوئی ہو۔

باقی سب بھی ہنس دیے۔ رونے سے آنکھیں اور چہرہ پہلے ہی سوجا ہوا تھا۔ اس پر بھینگا پن۔۔۔ قیامت یعنی دو آتشہ۔

"تجھے تو پتا ہے نا عبدالعزیز! میرا ذہن چھوٹا بنایا اللہ نے۔۔۔ ساری زندگی وہی کام کیے جو ضروری تھے جن کے بغیر گزارا نہیں تھا۔ اسے ہی سوچا جو سامنے نظر آیا۔

تم بھی مجھے معاف کر دینا ناہید۔۔۔ چھوٹی عورت سمجھ کر۔۔۔ میرا تو قد بھی تم سے کم ہے۔" پھپھی کا لہجہ شرمسار تھا، دلیل بھی خوب دی۔

"بھولی آپا۔۔۔!" ناہید نے پھپھی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ "اتنے قابل بیٹے کی ماں کا قد چھوٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ اے ڈی کے کندھوں پر چڑھ کر دنیا دیکھیں آپ۔۔۔"

"تو مجھ سے ناراض تو نہیں۔۔۔!" پھپھی کو اندازہ تھا زیادہ دل ناہید ہی کا دکھایا ہے اس نے۔۔۔

"نہیں۔۔۔ بلکہ آپ بتائیں۔ آپ تو مجھ سے ناراض نہیں۔۔۔ وہ سب خیال جو میں آپ کے بارے میں رکھتی تھی۔"

چائے کے گھونٹ خاموشی سے بھرتی صفیہ سب کے بیچ بیٹھے ہونے کے باوجود الگ محسوس ہو رہی تھیں۔

یہ معافی تو انہیں مانگنی تھی، وہی تو تھیں، جو ناہید کے خیالات کو توڑ موڑ کر اپنی مرضی کا بنا کر بھولی کے آگے پیش کرتی تھیں۔

اور پیش کش کی اہمیت سے کیسے انکار ہے؟

"تم کچھ نہیں بول رہیں چھوٹی بھابھی۔۔۔؟"

عبدالعزیز نے پکارا۔

"کیا بولوں۔۔۔؟" وہ اظہار کی قوت کھو چکی تھیں کیا؟

"بھولی آپا سمیرا اور اے ڈی کی شادی کے لیے دن مانگ رہی ہیں۔ تم بھی کوئی مشورہ دو۔"

"جو آپ کو مناسب لگے۔" صفیہ نے ناہید کی آڑ میں بیٹھی سمیرا کو دیکھا پھر اے ڈی کو۔ وہ کتنا سنجیدہ متین بن کر بزرگوں کی محفل میں براجمان تھا۔ مودب و محتاط (ہاں محتاط۔۔۔ نگاہوں کی چوری کا کھیل اتنے لوگوں کے بیچ بیٹھ کر کھیلنے والے سے بڑا محتاط اور کون ہو گا۔ ایک نرم گرم نگاہ وہ ناہید کے پہلو پر ڈال ہی لیتا تھا)

صفیہ دل سے اٹھتی صدا پر ایمان لے آئیں، وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ تو پھر خواہ مخواہ انہوں نے اتنا کھڑاک کیوں ڈال دیا۔ وہ متاسف تھیں۔

سمیرا کے چہرے کے رنگ۔۔۔ وہ شرمگیں مسکان۔۔۔ پلکوں کا اٹھنا اور جھکنا۔۔۔ اور اے ڈی۔۔۔ وہ سنجیدہ تھا، مگر اس جانب دیکھنے پر مجبور بھی لگتا تھا اک نظر جیسے فرض تھی۔

"اپنے ابو سے کہو، لگے ہاتھوں میرے دن بھی مانگ لیں چھوٹی بھابھی سے۔۔۔!" برتن اٹھا کر لے جانے کے بہانے حمیرا معید کے پاس گزری۔

"تمہیں ذرا شرم نہیں آتی۔" وہ بڑبڑایا۔

"بے وقوف، موقع سے فائدہ اٹھانا سیکھو۔۔۔" وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

"یہ تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہو۔" عبدالعزیز کا دھیان ادھر ہوا۔

"کچھ نہیں تایا ابو۔۔۔!" وہ سیدھی ہو کر فوراً "نیک پروین" ہو گئی۔ "یہ معید کچھ کہہ رہا تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا۔ بولو بیٹا۔۔۔!"

"نہیں تو کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔" وہ سٹپٹایا۔

"اب مگر کیوں رہے ہو ابھی تو میرے کان کھا رہے تھے۔" حمیرا مجبور نظر آئی۔

"حمیرا۔۔۔!" اس نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔

"تم ہی بتادو کیا کہہ رہا تھا۔" عبدالعزیز نے حمیرا سے ہی پوچھ لینا مناسب سمجھا۔

"بتادوں۔۔۔" اس نے معید سے پوچھا پھر پلکیں پٹپٹاتے ہوئے لب کھولے "کہہ رہا تھا۔ ابو سے کہتا ہوں صفیہ چچی سے حمیرا کے دن بھی لے لیتے ہیں۔"

"کیا۔۔۔؟" معید کرسی سے اچھل پڑا۔

"میں نے کہا میں لڑکی ہو کر ایسی بات کیسے کر سکتی ہوں آفٹر آل میں مشرقی لڑکی ہوں جو جان سے چلی جاتی ہے مگر آن نہیں جانے دیتی۔"

"یہ جھوٹ بول رہی ہے ابو۔ بکواس کرتی ہے۔" معید اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"اب مجھے پریشرائز کرنے کے لیے چلا رہا ہے۔ کیا یہ ساری زندگی مجھ پر ایسے ہی رعب جھاڑے گا۔" سخت فکر مندی سے حاضرین کو دیکھا۔

دیکھنے کی چیز اس وقت پھپھی بھولی تھی۔ ناک پر انگلی ٹکا کر وہ سخت اچنبھے سے حمیرا کو سن رہی تھی۔

"اپنی شادی کی بات کوئی ایسے کرتا ہے سب کے بیچوں و بیچ منہ پھاڑ کر۔۔۔ اور چلو معید نے ایسا آئیڈیا دے بھی دیا تھا تو لڑکے تو ایسی شوخیاں کرتے ہی ہیں۔ لڑکی ہی کو "پی لینا" چاہیے تھا۔"

پھر پھپھی نے جو کچھ سوچا وہ پی بی حمیرا سے کہہ بھی دیا۔ معید کے سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ وہ پرسکون ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

پھپھی بھولی دوبارہ اپنا سوال دہرا رہی تھی، مگر عبدالعزیز کا دھیان صفیہ کی خاموشی پر تھا۔ حمیرا نے اپنا معاملہ معید سے درست کروالیا تھا، مگر صفیہ کی مرضی کے بغیر۔۔۔ انہوں نے بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی یہی سوچ رہی تھیں۔ صفیہ گم صم تھیں۔ نجانے دھیان کا پنچھی کدھر اڑان بھر گیا تھا۔

حمیرا کی اتنی قابل گرفت حرکات پر وہ ناگواری یا تنبیہہ کا ہنکارا بھی نہ بھر سکی تھیں۔ ناہید نے آنکھ کے اشارے سے شوہر کو "ابھی اس بات کو رہنے دیں" کا کہا۔

حمیرا بڑے مزے سے عبدالعزیز کے ساتھ کرسی جوڑ کر دن تاریخ طے کرنے کے لیے کیلنڈر اور قلم اٹھا لائی۔ اے ڈی نے اس موقع پر پھپھی بھولی کا بیٹا ہونے کا ثبوت دیا۔ شرم کا تقاضا تھا اس کی شادی کی بات ہو رہی تھی۔ اسے اٹھ جانا چاہیے تھا۔

وہ معذرت کرتے اٹھا۔ اسے اس تخت کے پاس سے گزر کر جانا تھا جہاں ناہید کے پہلو میں سمیرا براجمان تھی۔ سب کا دھیان کیلنڈر پر تھا، لیکن یہ کیا۔۔۔ سمیرا کی طرف دیکھ کر کوئی شوخ بات۔۔۔ یا شوخ اشارہ کرتا جبکہ وہ اس پر اک گہری گرم نگاہ ڈال کر نکلتا چلا گیا۔

"ایسے تو کبھی نہیں ہوا۔۔۔ کبھی بھی۔۔۔" سمیرا کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے سب کو دیکھا۔ سب گم تھے۔

ایسا کیوں لگا وہ خفا تھا۔۔۔ اور اگر تھا تو کیوں؟ سمیرا حق دق تھی۔

✲ ✲ ✲

"مجھے کسی کی بات سے غرض نہیں کہ اس نے یہ کہا اور اس نے وہ۔۔۔ میرا سوال صرف یہ ہے کہ تم نے میرے بارے میں یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔۔۔ اور حمیرا۔۔۔ سے۔"

اے ڈی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اسے جملہ مکمل کرنے سے بھی کراہت سی محسوس ہوئی تھی۔ حمیرا اسے اپنی چاروں بہنوں کی طرح پیاری تھی۔ ایسا خیال تو خواب میں بھی نہیں آیا تھا کہ وہ حمیرا سے شا۔۔۔ اونہوں۔

"میں نے سوچا نہیں تھا۔ پھپھی اور چچی نے بتایا تھا۔" سمیرا کتنی بار وضاحت دے چکی تھی۔

"تو تم نے یقین کیوں کیا؟" سوال ہنوز اٹکا ہوا تھا۔

سمیرا نے اپنی نم ہتھیلیاں آپس میں رگڑیں۔ وہ سب کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں آئی تھی۔ ناراضی کے وہم کو دور کرنے کے لیے اے ڈی کا نمبر ملایا۔۔۔

پر یہ کیا...؟ کال وصول ہی نہیں کی جارہی تھی۔ ابھی جب وہ یہاں سے گیا تھا تو فون اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ وہ مسلسل ملاتی رہی پھر پیغام لکھا۔

"پک دی فون اے ڈی..." جواب ندارد...

دل کی بے چینی حد سے سوا ہو گئی۔ پنکھے لگ گئے جب بالآخر جواب آیا۔ "مجھے فون مت کرو... مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔"

وہ بھونچکی رہ گئی۔ اندر سارے بڑے دن طے کر رہے تھے اور وہ کہتا تھا۔

"مجھے کال مت کرو... مجھے بات نہیں کرنی۔" مگر کیوں؟ تو اس کا خدشہ درست تھا۔ وہ ناراض تھا۔

شدید بے قراری کے عالم میں وہ گھر سے نکل آئی۔ اندر سب لوگ خوش گپیوں میں محو تھے اور سامنے پھپھو کے گھر کا دروازہ نیم وا تھا۔ اے ڈی کے اسٹڈی والے بڑے کمرے کی روشنی باہر آرہی تھی۔ وہ دروازے کی طرف پشت کیے کرسی پر بیٹھا تھا۔ سامنے میز پر فون پڑا تھا۔ اور اس پر مسڈ کال کی تعداد نمایاں تھی... میسجز کے سائن والا لفافہ بار بار جل بجھ ہوتا تھا۔

"تو وہ واقعی خفا تھا پر کیوں...؟"

اور جب سب بتایا (پھپھی بھولی نے پہلے جرم بیٹے کے سامنے قبولا تھا۔ سمیرا کے رونے کا بتایا تھا)

وہ پوچھ رہا تھا کہ وہ اس سے بدگمان کیوں ہوئی' وہ کوئی موم کا گڈا تھا جو سہرا لگا کر اندھا دھند نکل پڑتا۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ماں کیا سوچ رہی ہے اور کیوں...

اور جب اسے پتا لگا تب... اس نے ماں کو کچھ نہیں کہا کیونکہ وہ خود ہی اپنی غلطیوں کو مان رہی تھیں۔ ان کے پاس جواز تھے جو شاید خود ان کی حد تک درست تھے' مگر سمیرا نے کیوں؟ (بعد میں حمیرا سے ساری تفصیل بھی مل گئی تھی)۔

اے ڈی قطعاً "ضدی" نہیں تھا' مگر سمیرا کیا کرتی کہ "کیوں" پر آکر اٹک گیا تھا۔

"سوری کر تو رہی ہوں۔" وہ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے بول رہی تھی جو کرسی سے اٹھ کر دیوار کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔

"اے ڈی...!" اس نے پکارا۔ کوئی جواب نہیں... سمیرا کا دل بھر آیا ساتھ ہی اسے احساس ہوا اگر پھپھی اوپر آجائیں تو...

"کیا میری آواز سنائی نہیں دے رہی'" وہ ایک قدم آگے ہوئی اور ذرا اونچا بولی۔ اس کی محبت لٹاتی نگاہیں اور سحر انگیز مسکراہٹ ہی دیکھی تھی۔

ایسی ناراضی... اور جب کہ وہ پکار رہی ہے' تب بھی... تو ٹھیک ہے۔ مانگ تو لی معافی... کرلی غلطی تسلیم... اب اور کیا کرے۔ قدموں میں بیٹھنے سے تو رہی۔ محبت کی شرائط میں پہلی شق برابری کی ہونی چاہیے۔

اور یہ بھی کہ۔

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں...

یہ کیا کم... وہ مجرم بنی کھڑی تھی اور تھک گئی تھی اور وہ بے حس بنا منہ موڑے کھڑا تھا۔

اور یہ بھی کہ وہ چل کر آئی تھی۔ اور اسے اس بات نے بھی نہیں پگھلایا تھا۔

"ٹھیک ہے پروفیسر اے ڈی ریاض... تو پھر میں بھی آپ کی کلاس کی کوئی نالائق اسٹوڈنٹ نہیں ہوں جو مسلسل معافی مانگتی رہوں اور آپ مڑ کر بھی نہ دیکھیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ چلتی ہوں عزت افزائی کا شکریہ۔ خدا حافظ۔"

اور اسی پر بس نہیں۔ وہ حافظ کے ظ سے پہلے قدم بھی بڑھا چکی تھی۔

"ارے او... ارے سمیرا! رکو..."

اے ڈی جست بھر کے اس تک آیا۔ کتنی اچھی لگ رہی تھی وہ معافی مانگتی۔ جی بھر کے دیکھنے کا ایسا موقع... دل تو اس کی آمد پر ہی باغ باغ ہو گیا تھا' مگر بس یونہی...

دراصل سمیرا کو خبر نہیں تھی' دیوار پر لگے ایک آئینے میں وہ پوری کی پوری دکھائی دے رہی تھی اے ڈی کو۔ بس اسی لیے...

پھر وہ تو رکنے کو تیار ہی نہیں تھی۔ آنکھوں میں نمی لیے مسلسل انکار۔ اے ڈی کو سچ بتانا پڑا۔ وہ بھڑک اٹھی۔

"آپ کو شرم نہیں آتی کسی کو چھپ چھپ کر دیکھتے ہوئے۔"

"اچھا۔۔۔" اے ڈی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہاں بیٹھ جاؤ میں تمہیں علی الاعلان دیکھ لیتا ہوں۔" وہ خود بھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ دیکھنا بھی شروع کر دیا۔

"لو خوامخواہ۔" وہ بدکی۔ دوپٹا درست کیا۔ ماتھے تک کھینچ لیا۔

اے ڈی دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ سب جس کے بارے میں سمیرا کہتی تھی۔ صاف صاف بات کیا کریں نا۔

"وہ امی کے خیالات تھے جو حالات سے پیدا ہوئے۔ مجھے تم جیسی ہو جو ہو اسی طرح پیاری ہو۔" اے ڈی کی نگاہیں اس کے سرخ چہرے پر ٹکی تھیں۔

"ہنر۔۔۔ بے ہنر۔۔۔ اونہوں۔۔۔ مجھے نہیں پروا۔۔۔ میرے گھر صرف محبت سیکھ کر آنا۔"

سمیرا کی نظریں بے ساختہ اٹھیں، مگر پھر جھک گئیں۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ تاب لے آتی۔

☼ ☼ ☼

"خود کی بیٹی انہیں حاسد کہہ گئی تھی تو کیا وہ واقعی تھیں۔"

کیسا گالی کی طرح لگا تھا یہ لفظ۔۔۔

نہیں وہ نہیں تھیں۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ وہ تو بس اپنی بیٹی کا بھلا چاہتی تھیں۔ اس کا حق تھا کہ وہ بحیثیت ماں بیٹی کے لیے اچھا برا سوچے اور کوشش کرے اور وہی اس نے کی تھی۔

لیکن یہ بھی تو سچ تھا نا۔ ناہید کو دیکھ کر دل میں طیش کی لہر اٹھی تھی۔

اور سمیرا کے چہرے پر نظر پڑتی تو قدرت کی صناعی کو سراہنے کے بجائے وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہو جاتی تھیں۔

اور حمیرا نے کہا یہی کیفیت تو حسد کہلاتی ہے۔

جب دل چاہے چہرہ بگاڑ دیا جائے۔ یہ اتنی اچھی ہے تو کیوں۔۔۔

اور یہ جو حسن ہے یہ آخر کیسے ختم ہو سکتا ہے۔

ہاں شکر خدا کا، وہ اتنی منتقم نہ ہوئیں عملی کوشش سے حسن کو ختم کرنے کا سبب ڈھونڈتیں مگر۔۔۔

سارا خاندان ناہید کو اس پر فوقیت دیتا تھا۔ اس کی صورت، اس کا طریقہ سلیقہ اس کا خاندان۔۔۔

اور مجھے من مانی کرنے والی بھگوڑی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ عزت دی ہی نہیں۔ میرے منہ پر کئی ایک نے کہا۔ "کیا دیکھ کر عبدالمجید نے عشق رچایا؟

حالانکہ وہ عشق تھا تو میں نے وفا بھی تو نبھائی۔

چونتیس برس کی عمر میں بیوہ ہوئی تھی۔ گیارہ برس کی بچی تھی۔۔۔ پھینک جاتی اسے کہیں۔۔۔ دس لوگ مل جاتے ہاتھ تھامنے کو۔ اسے کسی نے نہ سراہا اور خیر میں نے یہ کام کسی تعریف کے لیے کیا بھی نہیں تھا، محبت تھی عبدالمجید سے۔۔۔ آج بھی ہے۔ اور حمیرا کہتی ہے میں حاسد ہوں۔

انہیں حمیرا کے جملے یاد آنے لگے۔

"یاد ہے کئی سال پہلے مجھے کہانی لکھنے کا شوق چڑھا تھا۔ پیاری سی شوخ محبت بھری کہانی۔۔۔

پیاری سی ایک لڑکی۔۔۔ اچھا سا ایک لڑکا۔۔۔ اور بہت ساری محبت۔۔۔ مگر مجھے جوڑ توڑ کرنا نہیں آیا۔۔۔ کہانی آگے بڑھ ہی نہ سکی۔۔۔ میں "غلط" لکھ ہی نہیں سکی۔ مجھے تو بس "سب اچھا" لکھنا آ رہا تھا۔ مجھے پتا ہوتا کہ آپ کتنی مہارت سے منظر بدلنا جانتی ہیں تو آپ سے پوچھ لیتی۔ سیکھ لیتی امی۔۔۔" اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

ہاں، وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں نے ناہید کے بھولی آپا پر کچھ اعتراضات کو کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ بھولی کے دل میں میل بھرا اور سمیرا کی شخصیت مزاج کو بھی تو گھٹانے کی کوشش کی تھی۔ نیل پالش لگانے والی اور بھولی نے خامیوں کی فہرست میں بے نمازی لکھ لیا۔ حالانکہ میں گواہ تھی۔ وہ تہجد کے وقت اٹھ کر بھائی

کی صحت و تندرستی کے لیے "گریہ" کرتی تھی۔ ابھی تک تو اس کے وہ نفلی روزے پورے نہیں ہوئے جو اس نے معید کو اسٹریچر پر دیکھ کر مان لیے تھے۔

اور اس کی طرف سے صدقہ جاریہ یہ تھا کہ اس نے اپنی زندگی ایسے لوگوں کے لیے وقف کردی تھی جو اچانک حادثات میں گھر جاتے ہیں۔ ان کی ذہنی و جسمانی بحالی۔۔۔ انہیں دوبارہ زندگی کی طرف موڑنے کی کوشش اور اس کی نفیس مزاجی کو سستی و کاہلی کے زمرے میں ڈال دیا بھولی نے ایک اور نمبر کاٹ دیا۔

اس کی نفاست پسندی کو "ادا" کہہ کر بھولی کے گھر کے لیے مس فٹ بھی تو میں نے ہی کیا تھا۔

تو پھر حمیرا ٹھیک کہتی ہے کہ۔۔۔

جس چیز کو بتانے اور سمجھانے کے لیے اور جس سے بچنے کے لیے اللہ نے پوری پوری دو سورتیں اتار دیں۔ سورۃ الناس اور سورۃ الفلق، حمیرا نے پہلے سورت پڑھی۔۔۔ پھر ترجمہ دہرایا۔

اس سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟

نفرت، محبت، بغض، عناد، غصہ، پیار اور بہت سی ایسی دوسری باتوں کی طرح حسد بھی انسانی فطرت کے اندر موجود ایک جذبہ ہے۔ یہ چیزیں انسان کے خمیر میں شامل ہیں۔ بس یہ ہے کہ۔۔۔ کون اس کی کتنی آبیاری کرتا ہے۔

"امی آپ کا معاملہ بس یہ ہے کہ آپ نے حسد کے اس عنصر کو اتنی محنت سے پروان چڑھایا کہ باقی سب جذبے پیچھے رہ گئے۔ اور حسد۔۔۔ اوہ۔۔۔" اس نے جھرجھری لی تھی۔ "یہ تو زندگی سے بے ساختگی بر جستگی کو نوچ لیتا ہے یہ ادھیڑ بن۔۔۔ میں جُت جاتا ہے حاسد کی۔۔۔ نیند اڑ جاتی ہے قرار لٹ جاتا ہے۔ نری بیماری۔۔۔"

(کہاں سے سیکھی تھیں اس نے یہ باتیں، صفیہ ششدر تھیں وہ تو گویا صفیہ کی کیفیت کا احوال بیان کررہی تھی۔ ہاں وہ اتنے سال بالکل ایسی ہی بے چارگی اور مشکل سے جی تھیں)

اور پتا ہے اللہ کیا کرتا ہے بیماری دیتا ہے تو شفا بھی بتا دیتا ہے۔ بس چاروں قل پڑھ کر خود پر پھونک لو۔ اس سے دوسروں کے حسد سے بھی بچ جاتے ہیں اور خود کرنے سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔

دل پھر بھی نہ مانے تو ان نعمتوں کو یاد کرلینا چاہیے جو میسر ہیں، چلتے پھرتے دل میں شکر بھرنے لگتا ہے۔

وہ تو مبہوت سی پڑھنے جاتی تھی۔ اس نے حسد کے موضوع پر پی ایچ ڈی کب کی۔ یہاں وہ کتنی بے خبر تھیں اپنی بیٹی کی صلاحیتوں اور ذہانت سے۔ شکل و جسم دیکھتی رہیں اگر اے ڈی ریاض اسے درست سمت نہ دکھاتا۔۔۔ تو کیسے ضائع کردیتیں وہ اپنی بیٹی کو۔۔۔ تو یہ تو اللہ کا پھر ان پر خاص کرم ہوا تھا کہ وہ دوسروں کے بچوں کے لیے اتنا غلط سوچتی رہیں، لیکن اللہ ان سے بے نیاز نہیں تھا۔

ادھر ادھر دھیان لگانے کے بجائے اپنی بیٹی کو دیکھ لیتیں تو جانتیں کتنی بڑی نعمت تو انہیں بھی میسر تھی۔ قابل بیٹی۔۔۔ (انچاس ہزار پانچ سو تو خالی تنخواہ تھی اس کی) صفیہ کی سوچوں سے پرے اس کا درس جاری تھا۔)

"حسد سے، شرک سے، بغض سے بچنا بہت ضروری ہے امی۔۔۔ حسد دنیا برباد کرتا ہے اور شرک آخرت۔۔۔"

چاروں قل بڑی ضروری چیزیں ہیں۔۔۔ دین کی پوری تعلیمات ان میں سمٹ آئی ہیں۔

اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ اللہ نے انہیں نماز کا حصہ بنا دیا تاکہ جو "دوا" سمجھ کر ہاتھ میں نہ لے وہ "دعا" سمجھ کر پڑھ ڈالے۔

کتنے پیار سے سمجھایا تھا اس نے۔۔۔ کسی کامل استاد کی طرح۔۔۔

اور کتنی خوش قسمت تھیں وہ۔۔۔ انہوں نے اسے جنم دیا تھا۔

علم کسی کی میراث نہیں۔۔۔ بعض دفعہ اولاد۔۔۔ بھی والدین کی تربیت کردیتی ہے کر سکتی ہے۔

"او میرے اللہ۔۔۔" صفیہ نے سر ہاتھوں پر گرالیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

شکر کے آنسو کہ شرم کے۔۔۔؟
مگر جس کے بھی۔۔۔ اللہ کو دونوں پسند ہیں۔

☼ ☼ ☼

"میں جب آپ کی جگہ پر خود کو رکھ کر سوچتا ہوں تو آپ بالکل صحیح لگتی ہیں چچی جان! بھلا کون ماں چاہے گی کہ اس کی بیٹی کسی ایسے شخص کو اپنی تمام زندگی کا ہم سفر بنائے جو ہم سفری کے بنیادی تقاضے بھی پورے نہ کر سکے۔"

اس کے جملے بہت دل گیر تھے دل چیر دینے والے جیسے۔۔۔ مگر ان کی ذرا سی پرچھائیں بھی چہرے سے عیاں نہ تھی۔

"وہ بہت تیز چلنے والی ہے۔ میں تو شاید چپل قدمی میں بھی قدم سے قدم نہ ملا سکوں۔" وہ مسکرایا تھا۔

"کل میری شاپ پر آکر اس نے مجھے قائل کر لیا تھا۔" اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔ "اور آپ تو جانتی ہیں اُسے قائل کرنا آتا ہے۔ میں بھی مان گیا لیکن جب تنہائی میں حقیقت پسندی سے سوچا تو وہ بے وقوف لگی۔ جذباتی، کم فہم۔۔۔"

صفیہ اس کا چہرہ پڑھنے کی تگ و دو میں تھیں۔ دل کا حال جاننے کی خواہش اور وہ سب سے بے پرواہ بول رہا تھا۔ وہ سب، جو اس نے بہت تسلی سے سوچا تھا اور ترتیب دیا تھا۔

"لیکن وہ اٹل ارادہ بھی رکھتی ہے، جو ٹھان لے تو ٹھان لے۔"

"تو پھر تم مجھے کون سی کہانی سنانے آگئے ہو، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے تھا ناں کہ ایک بے وقوف لڑکی کیسے تمہارے لیے اپنی ماں کے مقابل آگئی ہے۔"

"بالکل ہونا چاہیے تھا۔" وہ بہت پیارا مسکرایا۔ "اگر خود غرض ہوتا۔۔۔"

صفیہ بری طرح چونکیں۔

"تم بہت اچھی باتیں کر سکتے ہو معید عبدالعزیز۔۔۔ خود کو لاتعلق ظاہر کرنا بہت آسان ہے۔ اس لیے کہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ تمہارا مقدمہ لڑنے کے لیے وہ بے وقوف لڑکی کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔"

"یہ الزام سچ نہیں ہے صفیہ چچی۔۔۔!" معید کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ "لیکن آپ مانیں گی نہیں۔۔۔ میں دس گواہ بھی لے کر آجاؤں کہ میں نے اسے کبھی نہیں اکسایا بلکہ کبھی جتایا بھی نہیں کہ ایک رشتہ اور بھی تھا ہمارے بیچ۔۔۔ یا یہ کہ رشتہ بڑھ بھی سکتا ہے سو بات ختم کرتا ہوں۔" وہ رکا پھر مضبوط لہجے میں کہا۔

"ابو مجھے علاج کے لیے ملک سے باہر بھیجنا چاہتے ہیں۔" صفیہ نے چونک کر دیکھا۔

انہیں ایسے کسی ارادے کی خبر نہیں تھی اور یہ کہ اب اس میں سے کیا ٹھیک کروانا باقی ہے۔ دیکھنے میں تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک لگتا تھا۔ ہاں ایک بار ناہید بھابھی آنکھ کے کسی آپریشن کی بات کر رہی تھیں تو کیا وہی۔۔۔ لیکن پھر بھی انہیں کیا۔ جاتا ہے تو جائے۔

صفیہ نے نخوت سے سر جھٹکا اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی صورت دیکھی۔

وہ سنجیدہ تو ہو چکا تھا مگر قطعیت کا یہ انداز۔۔۔ وہ مزید کیا کہنے والا تھا۔

"اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں واپس نہیں آؤں گا۔" بالآخر اس نے دھماکا کر دیا۔ "کم از کم اس وقت تک جب تک آپ اپنی پسند سے اپنی بیٹی کی زندگی کے فیصلے نہ کر لیں۔"

"اور جیسے کہ وہ مان جائے گی ناں۔۔۔!" صفیہ کا دل پگھلا تھا مگر بس پل بھر کی تھی یہ کیفیت۔ بڑا چبھتا لہجہ تھا۔ لیکن وہ مسکرانے لگا تھا۔

"نہ مانے، مگر کب تک نہیں مانے گی۔ میں کسی گوری چٹی میم کے ساتھ تصویریں بنوا کر بھیج دوں گا۔ سارے شہر کو دکھا دیجیے گا اور حمیرا کے لیے جو اسپیشل کاپی بھیجوں گا۔ اس کے پیچھے جلی حروف میں لکھ دوں گا۔ "بھابھی۔۔۔ کیسی لگی؟"

اس کا چہرہ ہی نہیں لہجہ بھی متبسم تھا۔ مگر وہ آنکھیں۔۔۔ فقط جھوٹ کہنے سے وہ اتنی دکھی ہو گئی تھیں۔

تو حمیرا۔۔۔اس جھوٹ کو سن کر وہ کتنی دکھی ہوتی؟
ہاں وہ دکھی ہوتی۔۔۔اسے اتنا دکھ ہوتا کہ اس کا دل پھٹ جاتا۔
وہ اتنا روتی کہ آنکھوں کا پانی خشک ہو جاتا۔
خود کو پیٹ ڈالتی۔۔۔اور ختم ہو جاتی۔
"ہائے اللہ نہ کرے۔۔۔" صفیہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔
کچھ ارادے معید عبدالعزیز بتا گیا تھا۔ اور حمیرا نے بھی تو ایک جملہ کہا تھا اور اس کے بعد وہ زندگی بھر بھی کچھ نہ بولتی۔ تو صفیہ کے لیے کافی تھا۔
"شادی تو میں معید ہی سے کروں گی امی۔۔۔اور آپ ہی کروائیں گی۔ پورے دل کی خوشی و قبولیت سے میں گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والی نہیں۔۔۔"
اور صفیہ کے سر پر جیسے کسی نے کلہاڑا مار دیا تھا۔ شدید خوف زدگی کے عالم میں بیٹی کی صورت دیکھی۔
کیا اس نے ماں کو سنایا تھا۔ جتایا تھا کہ وہ۔۔۔
یا اللہ۔۔۔ان کی بیٹی انہیں طعنہ دے گی۔ یہ تو صفیہ نے کبھی نہیں سوچا تھا۔
وہ تو اس چیز کی شعوری ولاشعوری کوشش کرتی رہیں کہ حمیرا کو کبھی پتا نہ چلے کہ۔۔۔لیکن ایسی باتیں کوئی چھپتی ہیں؟ آج بیٹی کے منہ سے۔۔۔
مگر۔۔۔وہ حمیرا کی صورت دیکھنے لگیں تو چونکیں۔
اس کے پیغام اور فیصلے میں جتانے کا گہرا تاثر ضرور تھا مگر چہرے پر ایسا کوئی رنگ نہیں تھا جو بتاتا کہ وہ ماں پر طنز کر رہی ہے۔ ہاں اس نے ماں کو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اس نے اپنے معیار اور اقدار کی بات کی تھی۔ اس نے ماں کو حق دیا تھا۔ ماں کا مان بڑھایا تھا۔ گھٹایا نہیں تھا۔
آپ ہی کریں گی۔ آپ ہی کو کرنا ہو گا۔ میں کوئی بے وقوفی نہیں کروں گی۔"
وہی اس کا بے ساختہ' بے فکر انداز۔۔۔اس نے اگر ماں کو دھمکایا بھی تھا تو اتنے مان سے۔۔۔اتنی عزت دی۔ بھروسا کر لیا اور اپنا آپ بھی بتا دیا۔ اس کے لیے کتنی اہم تھی صفیہ کی منظوری' خوشی۔۔۔وہ اپنی ذات پہ

اختیار رکھتی تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ سر جھٹک کر کہہ سکتی تھی صفیہ۔۔۔کون صفیہ۔۔۔زندگی تو اس کی ہے اس کو گزارنی ہے۔
اور معید عبدالعزیز۔ سب اس کے ساتھ تھے۔
پھر۔۔۔؟ وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ فرماں برداری۔۔۔اوہ خدا۔۔۔
حمیرا صفیہ کی بیٹی تھی مگر ماں پر نہیں گئی تھی۔
معید۔۔۔عبدالمجید کا بھتیجا تھا' اور اس پر نہیں گیا تھا۔ ورنہ راہ بھٹا تا ہاتھ پکڑ کر نکل لیتا۔۔۔تو وہ کیا کر لیتیں۔
تو صفیہ عبدالمجید تم نے زندگی بھر کیا کیا؟"
حمیرا نے کہا تھا' وہ کسی مکمل صحت مند توانا شخص سے شادی کر لیتی ہے۔ مگر اس کی کیا گارنٹی ہے۔ کہ وہ شہہ زور اور توانا رہے گا۔ حادثہ تو شادی کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔
اور کیا تب وہ شوہر کے عیب دیکھتے ہوئے اپنی بستی گھر ہستی چھوڑ آئے گی۔۔۔کبھی نہیں (کوئی عورت ایسا نہیں کرتی اور یہاں تو اس کا دل دھڑکتا تھا معید کے نام پر)
بات تو ٹھیک تھی۔ مرنے کے خوف سے لوگ جینا تو نہیں چھوڑ دیتے۔
اور عبدالمجید بھی تو صفیہ کو بیچ راستے میں چھوڑ گیا تھا۔ تو پھر تو صفیہ کو اس سے شادی کرنی ہی نہیں چاہیے تھی کہ۔ اس نے تو مر جانا ہے۔
تو ایسے نہیں ہوتا۔ انسان ہر کام اچھی امید اور توکل کے سہارے کرتا ہے۔
زندگی کتنی آسان بلکہ عیش و آرام سے گزری۔
کیسی تھی وہ شام۔۔۔جب گھر خالی کرنے کا نوٹس مل گیا تھا اور جیب میں پیسے نہیں تھے۔ گاڑی تھانے میں کھڑی تھی۔ صفیہ کے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں نے صاف انکار کر دیا تھا جیو یا مرو۔ ہم سے کوئی تعلق نہیں۔
اور دروازہ قرض خواہ بجاتے تھے اور دیکھتے تھے صفیہ کو بھی۔۔۔اور کچھ صفیہ کی بیٹی کو بھی۔۔۔گھر سے

نکلتیں تو کہاں جاتیں۔ رات کیا فٹ پاتھ پر کٹتی... یا'
یا...

اللہ تو ہمیشہ سے مددگار رہا تھا۔ جب دنیا کے سارے در بند ہو گئے۔ تب اللہ نے فرشتہ بھیج دیا۔ اللہ کبھی خود سامنے نہیں آتا کسی کو بھیجتا ہے اور وہ "کسی" عبدالعزیز تھے۔ جنہوں نے صرف سہارا نہیں دیا۔ عزت بھی دی۔ دنیا کے مصائب' عیاری اور گندی نظروں کے سامنے ڈھال بن گئے۔

"آپ سوچیے امی اگر اس شام بڑے ابو نہ آتے تو آج ہم کہاں اور کس حال میں ہوتے۔ انہوں نے عزت تو دی۔ محبت بھی دی اور آپ نے کیا کیا...؟ ہمیشہ بدگمان رہیں۔ بلکہ بدگمان نہیں انجان... آپ کو ادراک ہی نہیں کہ کیسے اللہ ہم پر مہربان رہا۔ ایک فرشتہ ہمیں زندگی بھر کے لیے دے دیا۔"

اور واقعی صفیہ... یہ تو تم نے کبھی سوچا ہی نہیں...

☼ ☼ ☼

پھپھی بھولی دن لینے کے بعد رات گئے تک بیٹھی رہی تھی۔ اے ڈی کو ہی بلانے آنا پڑا اور صفیہ کے لیے سب کے درمیان بیٹھنا بہت مشکل تھا' مگر کیا کرتیں کہ عبدالعزیز ہر بات طے کرتے ہوئے...

"کیوں چھوٹی بھابھی! کیا خیال ہے؟"
یا
"تم بھی تو بولو... یہ ٹھیک رہے گا یا وہ...؟"

اور ناہید بھی منتظر نگاہوں سے دیکھتی تھیں جیسے صفیہ کی رائے سب سے اہم ہو اور یہ عزت اور مان... زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ جتنا کہ نظرانداز کرنا نہ لگتا۔ محفل ختم ہوئی تو وہ اپنے کمرے میں آکر خود احتسابی میں گھر گئی تھیں۔ بیٹی نے جو رات کہا تھا "نہیں حاسد...

اور جو شام کو سمجھایا تھا وہ سبق...

عشاء کے لیے کھڑی ہوئیں تو ساڑھے گیارہ ہو چکے تھے۔ دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو کتنی ہی دیر بس ہتھیلیوں پر برسات ہوتی رہی اور نجانے وہ کب تک یونہی رہتیں۔ جب حمیرا کی ہڑبڑ آمد نے چونکایا۔

اس نے زور سے دروازہ کھولا تھا۔ وہ ان سے کچھ پوچھتی آرہی تھی انہیں جائے نماز پر بیٹھا دیکھ کر لب بھینچ لیے۔

"کیا ہوا؟" صفیہ نے جائے نماز کا کونا موڑا۔ گھبراہٹ سی ہوئی۔ اس کے پیچھے معید بھی اندر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

حمیرا ان کے پاس بیٹھ گئی۔ "تم بھی آجاؤ ادھر... یہ فیصلہ ہو جاتا ہے۔"

معید ذرا سا ہچکچایا۔ "میں ٹھیک ہوں ادھر ہی..."

"آؤ نا...!" حمیرا نے ہاتھ بڑھایا۔ "بیٹھو...! امی پھونک ماریں گی۔"

معید اپنی جگہ سے نہیں ہلا... صفیہ کے دل کی خبر نہیں تھی۔ سب کچھ تو حمیرا ہی ٹھانے ہوئے تھی۔

"مسئلہ کیا ہے؟" صفیہ نے معید سے نظر ہٹا کر بیٹی کو دیکھا۔

"کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ وال کلاک دیکھیں... کیا بجا ہے؟"

"وال کلاک...؟" صفیہ نے گردن موڑی "بارہ بج رہے ہیں۔"

"ہاں... اور اس نے مجھے وش نہیں کیا۔ میری برتھ ڈے تھی آج..."

"مائنڈ یو... تمہارے برتھ سرٹیفکیٹ پر یکم اپریل لکھا ہے۔"

"مجھے فول بننا پسند نہیں... اسی لیے میں اکتیس مارچ لکھتی ہوں۔"

"تمہارے لکھنے سے کیا ہوتا ہے حقیقت بدل تو نہیں جاتی۔"

"حقیقت یہ ہے کہ میں رات بارہ بجے پیدا ہوئی تھی۔ کیوں امی...؟"

"ہاں زوال کا وقت... بارہ..." معید نے ٹھٹھا

اڑایا۔

"معید...!" اس نے دھاڑ لگائی۔

"امی...!" اگلی پکار صفیہ کے لیے تھی۔ وہ معاملہ حل کیوں نہیں کرتیں۔

"ہاں بارہ ہی بجے تھے۔"

"تو پھر برتھ سرٹیفکیٹ پر یکم اپریل کیوں لکھا؟" معید کا سوال وزن رکھتا تھا۔

"وہ تو اس کے ابو نے لکھوایا تھا۔"

"او ابو...!" حمیرا نے چھت کی طرف دیکھا۔ "بہرحال... برتھ سرٹیفکیٹ جو مرضی کہے، مجھے فول نہیں بننا... ویسے بھی مجھ جیسی لڑکی مارچ ہی میں پیدا ہو سکتی ہے۔"

"کیوں...؟" معید نے ابرو چڑھائے۔ "تم میں کیا خاص ہے... بلکہ مارچ میں کیا خاص ہے؟" وہ بھنایا تھا۔

"مارچ...!" وہ بہت پیارا مسکرائی۔ "بہار کا موسم... پھولوں خوشبوؤں، رنگوں کا موسم... مجھ جیسی لڑکی ایسے ہی کسی مہینے میں پیدا ہو سکتی ہے۔ بہار جیسی لڑکی حمیرا عبدالمجید۔" وہ کھلکھلائی۔

معید لاجواب ہوا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔ صفیہ نے دونوں کو ایک نظر سے دیکھا۔

"شکر ہے کہ کوئی ایسا بڑا نقصان نہیں ہوا جس کی تلافی نہ کی جا سکتی۔ ایسی کھلکھلاہٹ، روشنی ہی تو چاہی تھی اپنی بیٹی کے لیے..."

"آپ نے پھونک نہیں ماری مجھ پر..." اس کی ہنسی تھمی تو اس نے صفیہ سے ڈپٹ کر پوچھا۔

صفیہ اپنے خیالوں سے چونکیں۔ حمیرا بڑے اہتمام سے چوکڑی مار کے منہ ذرا سا آگے کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔

صفیہ کی نگاہیں دروازے کی جانب اٹھیں۔

معید سینے پر ہاتھ لپیٹے چوکھٹ کا سہارا لیے پیروں کی قینچی بنائے ذرا سا ترچھا کھڑا حمیرا کے لاڈ اور مان کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

کتنے برے الفاظ سے پکارا تھا اسے ہمیشہ... صفیہ خود سے خفا ہونے لگیں۔

"ادھر آؤ..." اسے پکارا۔ وہ حیران ہوا۔

"ہاں تم..." صفیہ نے سر ہلایا۔

معید کچھ نا سمجھی کے عالم میں نزدیک آیا۔ صفیہ بیٹھ جانے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ وہ کچھ جھجکا، مگر بیٹھ گیا۔

اور صفیہ نے اسے حیران کر دیا۔ حمیرا کو بھی، مگر معید کو زیادہ۔

صفیہ نے اپنی مانگی ہوئی ساری دعائیں ان دونوں پر پھونک دی تھیں۔ دعائیں یعنی خواہشیں... دعا یعنی اقرار...

"یاہو..." حمیرا پہلے ہوش میں آئی۔ معید تو گم صم ہو ہی گیا تھا۔ وہ صفیہ سے لپٹ گئی۔

"ارے ارے..." صفیہ چلاتی رہ گئیں۔

"اب کہو..." صفیہ کمرے سے نکل گئیں تب وہ معید کی سمت متوجہ ہوئی۔

"کیا؟"

"مارچ کہ اپریل..."

"مارچ...!" معید نے مان لیا۔

"بس... اب یہ بھی کہو... محبت، مارچ کا موسم..." معید نے اس کے سراپے پر نگاہ ڈالی۔

قرمزی رنگ کے سادہ سوٹ پر دنیا جہان کے شوخ دھاگے بنے ہوئے تھے۔ اس کی ذہانت سے پُر آنکھیں۔ صحت مند سراپا...

پر وہ پیاری کتنی لگ رہی تھی۔ پھول، خوشبو، بہار سی لڑکی۔

ہاں... محبت مارچ کا موسم... وہ مان گیا تھا۔